إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اکتوبر ۲۰۲۳ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan October 2023

فزیکل و آن لائن

اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے

حلقۂ تفہیمِ فکرِ مغرب

ایامِ تدریس: بروز: جمعہ ہفتہ بعد نمازِ مغرب

عصرِ حاضر میں مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ ان کے اکثر مسائل کا بنیادی سبب ہے اور غلبۂ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے لہٰذا مغربی فکر کی تفہیم ناگزیر ہے۔

تحریک اصلاحِ تعلیم تفہیمِ فکرِ مغرب کے لیے اہل لاہور کے لیے فزیکل اور بیرونِ شہر کے خواہش مند حضرات کے لیے آن لائن کورس کا انعقاد کر رہی ہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات رابطہ فرمائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین
صدر تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ لاہور

نصاب

* بنیادی نظریات
* فکری تحریکیں
* فلاسفہ و دانشور
* مغربی اقدار
* مغربی فکر و تہذیب کے اثرات مسلم نظام تعلیم، معاشرت، معیشت، سیاست، عدالت، قانون وغیرہ

برائے رجسٹریشن: 0300-4107282 0333-1913636 حافظ محمد عمران طحاوی

178 نیلم بلاک، گلی نمبر 2، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب۔خدشات و مضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ و طالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
۹	اسلامی علوم میں تحقیق	۲۷۲
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۱۰	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۱	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۲	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۳	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۴	مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ و تجزیہ	۱۵۶
۱۵	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۶	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۷	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۸	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۹	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۲۰	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
۲۱	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲
۲۲	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۳	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۴	اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر و تہذیب	
۲۵	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۶	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۷	اسلام اور ردِّ فکرِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۸	مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۹	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۳۰	رزم حق و باطل	۸۰
۳۱	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۲	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۳	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۴	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	اللغة العربية	
۳۵	السلطة التشريعية_ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۶	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۷	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۸	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ای میل ermpak@hotmail.com

زیرِ سرپرستی
محمد منشا طور صاحب

اساتذہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، حافظ محمد عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

فتنوں سے بچنے کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ (ترمذی)

فیزیکل و آن لائن

جوان و بزرگ دونوں کے لیے

رُجوعِ اِلی القُرآن کورس

کورس کے لیے رجسٹریشن جاری ہے

دورانیہ: تین ماہ (خواہش مند طلبہ اس کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکیں گے)

اہلیت: ایف اے (صرف مردوں کے لیے۔ عمر کی کوئی قید نہیں)

اوقات تدریس: گروپ A: صبح 10 تا 1 بجے دوپہر گروپ B: شام 7 تا 9 بجے

ایام تدریس: بروز: پیر تا جمعرات

نصاب

۱۔ قرآن حکیم: تجوید، ترجمہ اور تحفیظ

۲۔ فہم قرآن و حدیث

۳۔ قرآنی عربی

۴۔ تزکیۂ نفس

۵۔ بنیادی فقہی مسائل

۶۔ لیکچرز (اسلام اور جدید مسائل، مسلم عروج و زوال، اسلامی تحریکیں، مغربی فکر و تہذیب وغیرہ)

تحریکِ رُجوعِ اِلی القُرآن

برائے رجسٹریشن: 0300-4107282 0333-1913636 حافظ محمد عمران طحاوی

بمقام 178 نیلم بلاک، گلی نمبر 2، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

رفعتِ شانِ مصطفیٰ

اے کہ ترے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود ہے وجہِ وجودِ کائنات

اے کہ ترا سرِ نیاز حدِّ کمالِ بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق قُربِ تمام عین ذات

اے کہ تری زبان سے ربّ قدیر گلفشاں
وحئ خُدائے لم یزل تھی تری ایک ایک بات

اے کہ تو فخرِ آدمی، واقفِ سرِّ عالمی
لوح و قلم سے بے نیاز تیرے علوم شش جہالت

تیرے عمل سے کھل گئیں تیرے بیاں سے حل ہوئیں
منطقیوں کی الجھنیں، فلسفیوں کی مشکلات

خُوگرِ بندگی جو تھے ترے طفیل میں ہوئے
مالکِ مصر و کاشغر وارثِ دجلہ و فرات

مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدی
تنگ مرے تصورات پست مرے تخیلات

نواب بہادر یار جنگؒ

ماہنامہ
البرہان
لاہور
جلد ۲۷، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۲۳ء/ ربیع الاوّل ۱۴۴۵ھ

مشمولات

O فکر و نظر — یہ منافقت کب تک؟ — ۴

O تعلیم و تربیت
- اصطلاحات کا ترجمہ کرنا غلط ہے — ڈاکٹر عثمان احمد — ۵
- بچوں کی ابتدائی قرآنی تعلیم کے تقاضے — ڈاکٹر انوار احمد بگوی — ۸
- بچوں کے موبائل کی نگرانی کیجیے — عابد چوہدری — ۱۱
- علم نہیں، گانا سیکھیں — پروفیسر عاصم حفیظ — ۱۲
- فرسودہ نظامِ تعلیم کی تباہ کاریاں — محمد سلیم منہاس — ۱۳

O فہم دین
- پاکستان میں غلبۂ دین کا متبادل لائحہ عمل — ادارہ — ۱۶
  مدیر کے مضمون پر قارئین کے تبصرے
- الخدمت و جماعت اسلامی: مغرب کی تحریک آزادیٔ نسواں — ڈاکٹر ابصار احمد — ۲۲
- کون سے علماء انبیاء کے وارث ہیں؟ — حافظ ڈاکٹر محمد زبیر — ۲۹
- قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری — سید خالد جامعی — ۳۴

O غامدیت
- غامدی مکتبِ فکر کا تصورِ نظم قرآن — احمد جاوید — ۴۴
- علمی اختلافات میں ریڈ لائن کیا ہے؟ — مدیر — ۵۴
- انذار و اصلاح کے اسلوب میں فرق — ۵۶

O تفہیم مغرب
- پاکستان کی حالیہ معاشی مشکلات اور ان کا حل — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۵۸
- مغربی تہذیب ایک دلدل ہے (۱) — ڈاکٹر احمد امتنان کاشف — ۶۳
- وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — عامرہ احسان — ۶۶

O اسلام اور مغرب
مسلمانوں کی بلادِ کفار کو منتقلی حرام نہیں — ڈاکٹر انعام اللہ — ۷۰

O تبصرۂ کتب
کتاب نما: متعدد کتب پر تبصرہ — مدیر — ۷۳

English Section — ۸۲
The Collapse of Liberal Democracy in Israel
Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محمد محسن یوسف
0306-4640366

فکر و نظر

یہ منافقت کب تک؟

جب ۱۲ ربیع الاوّل آتا ہے، ہم پاکستانی 'عید' مناتے ہیں۔ گلیاں سجاتے ہیں، عمارتوں پر قمقمے لگاتے ہیں، بچے پہاڑیاں بناتے ہیں، خوش حال لوگ غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم جھوم جھوم کر نعتیں پڑھتے ہیں۔ میلاد مناتے ہیں، سیرت مصطفیٰ پر کانفرنسیں کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ہم ہر موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کا نام نامی جب بھی لیا جائے ہم آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ اپنے ہاتھ چوم کر آنکھوں اور ماتھے پر لگاتے ہیں۔

ہم یہ سب کرتے ہیں لیکن وہ کام نہیں کرتے جو دراصل کرنے کا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے۔ معاف کیجیے گا ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہیں کرتے، صرف دعویٰ محبت کرتے ہیں اور ہمارا محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے، محض ایک رسم ہے۔ یہ منطقی اور نفسیاتی طور پر ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم جس سے محبت کریں، اس کی خوشنودی نہ چاہیں، اس کی بات نہ مانیں۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں، اس کی مانتے بھی ہیں، اسے خوش بھی کرنا چاہتے ہیں، اس کی ناراضگی سے بھی ڈرتے ہیں اور ہم ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے محبوب خوش ہو جائے، ہم سے راضی ہو جائے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہمارا محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہ محض رسم ہے۔ اور یہی ہماری ساری کمزوریوں کا اور ہمارے زوال کا بنیادی سبب ہے۔ لیکن ہم یہ بات کب سمجھیں گے؟ ہم یہ منافقت کب چھوڑیں گے؟

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر عثمان احمد [۱]

اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ کرنا ہی ہو تو مفہومی ترجمہ کرنا چاہیے

اصطلاحات کا ترجمہ کرنا غلط ہے

ویسٹرن 'سویلائزیشن' کا ترجمہ مغربی 'تہذیب' کرنا غلط ہے
اس کا صحیح اور مفہومی ترجمہ 'جاہلیت' ہے

معاصر علمی دنیا کو جن تحدیات کا سامنا ہے ان میں سے ایک مغربی غلبے کے نتیجے میں اصطلاحات کا خلط مبحث ہے۔ علمی مرعوبیت نے مغربی فکریات کو اردو میں ڈھالنے کے لیے فکر کی حقیقت کو مدنظر رکھنے کی بجائے قبولیت کے اصول کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کیا۔ اگرچہ مغرب نے اصطلاحات سازی میں بہ قول اقبالؒ ''چہرہ روشن'' کے اظہار اور ''اندرون چنگیز سے تاریک تر'' کی پوشیدگی کو پیش نظر رکھا مگر مسلم علمی دنیا بھی ''غلامانہ بصیرت'' سے آگے بڑھی اور قدموں میں سر رکھ دیا۔ اس وقت ہم جس اصطلاح کے ترجمے کے بارے میں چند گزارشات پیش کریں گے وہ سویلائزیشن (Civilization) کا ترجمہ ''تہذیب'' ہے۔ ''شہریت'' یا ''حضارت'' کا ترجمہ اختیار کرنے کی بجائے ''تہذیب'' کہنا سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اور کچھ نہیں۔ جب ویسٹرن سولائزیشن ''تہذیب'' ہی ہے تو ''تہذیب'' کیسے باطل وانحرافی ہوسکتی ہے؟ مہذب ہونا کیسے برا ہوسکتا ہے؟ ''مغربی تہذیب'' کا ترجمہ اختیار کر کے علمی مباحثوں میں مصروف اہل علم کو درج ذیل نکات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

اوّل: دین کی بجائے تہذیب کا لفظ جب مباحث میں تسلیم شدہ اصطلاح کی حیثیت سے برتا جائے گا تو لامحالہ گفتگو میں دینی اصطلاحات واحکامات غیر متعلق ہو جائیں گے۔ لہٰذا حرام وحلال، کافر ومومن کی دینی اصطلاحات کو گفتگو سے خارج کرنا پڑے گا۔ تہذیب کے تناظر میں کافر ومومن کوئی نہیں ہوتا یہ دین کا مسئلہ ہے۔

دوم: قرآن مجید نے یہود ونصاریٰ کے سب بگاڑ کے باوجود ان سے مخاصمہ ان کے نام

---

[۱] شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یہود ونصاریٰ کے ساتھ ہی کیا۔ تردید نصاریٰ کرتے ہوئے ان کے ہر بگاڑ پر تنقید دینی اصول وفروغ کے مطابق کی نہ کہ ''رومن تہذیب'' قرار دیتے ہوئے تنقید کا رخ غیر دینی اصولوں کی طرف پھیرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود ونصاریٰ کے طور طریقے اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ دینی اصول پر گفتگو کرتے ہوئے نصرانیت اختیار کرنے والے مسلمان کو ''مرتد'' کہا جائے گا۔ لیکن جب دین کو غیر متعلق کر کے ''ویسٹرن سویلائزیشن'' کی اصطلاح کو اصل الاصول بنالیا جائے تو یہودونصاریٰ کے فکری وعملی بگاڑ کی اس انتہا بعنوان ''ویسٹرن سویلائزیشن'' کو اختیار کرنے والے کو کیا کہا جائے گا؟ کیا یہود ونصرانیت کے یہ طور طریقے تہذیب کی اصطلاح کے تحت قابل قبول سے بڑھ کر قابل ستائش نہیں بن جاتے؟

سوم: ''ویسٹرن سویلائزیشن'' کی اصطلاح کو قبول کرنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ ''خاتم التہاذیب'' یہی ہے۔ چنانچہ مغرب کے اہل علم یہی کہتے ہیں کہ بابل ونینوا کی تہذیبیں بلاشبہ تہذیبیں تھیں، رومی وایرانی تہذیبیں بھی کوئی شک نہیں تہذیبیں ہی تھیں۔ اسلامی تہذیب بھی ایک حقیقت تھی۔ وہ عروج دیکھنے کے بعد زوال کا شکار ہوگئی۔ جس طرح بابل ونینوا اور رومی وایرانی تہذیبوں کو دوبارہ طلب کرنا اوران کے عروج کی خواہش رکھنا حقیقت پسندی نہیں ایسے ہی اسلامی تہذیب کے احیاء کی خواہش غیر فطری ہے۔ مغربی تہذیب نے سب کی جگہ لے لی۔ وہ تہذیبیں اپنی عمر پوری کر کے ختم ہوئیں اوراب مغربی تہذیب ایک آخری حقیقت ہے۔ یہ تہذیب خاتم التہاذیب اور تاریخ کی آخری تہذیب ہے۔ جب ہم ''دین اسلام'' کی اصطلاح ہی سے نکل جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کے اعتقادی اصولوں کی بجائے ''تہذیب'' کی اصطلاح کو ایک طے شدہ علمی حقیقت مان لیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ''مغربی تہذیب'' ہی حتمی حقیقت ہے۔

چہارم: اسلامی تہذیب کی اصطلاح وضع کرنے والے مسلم اہل دانش نے مغالطوں کے انبار لگا دیے۔ کلچر، تمدن اور مراسم سماج اور مذہبیت کے مابین خلط کا شکار ہوئے۔ نیز ایک طرف یہ دعویٰ کیا کہ اسلامی تہذیب کے اساسی عناصر کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اسلام کے دیگر معتقدات ہیں جب کہ دوسری طرف اس کے بھی قائل ہوئے کہ اسلامی تہذیب اب کہیں

û بالفعل موجود نہیں۔ یہ تضاد بیانی کی سی صورتِ حال ہے۔ اسلامی معتقدات وعبادات اپنی اصل کے ساتھ مسلم سماج میں قائم ودائم ہیں۔ مساجد آباد ہیں، روزے رکھے جاتے ہیں، ہر سال اربوں روپے لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں اور لاکھوں لوگ حج کرتے ہیں لیکن اسلامی تہذیب کو بالفعل غیر موجود بھی مانا جاتا ہے اور اس کے احیاء کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

چنانچہ یہی بہتر محسوس ہوتا ہے کہ فکری وعملی مغالطوں سے بچنے کے لیے اصطلاحات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ انہی الفاظ کو اپنی زبان میں بعینہٖ قبول کرلیا جائے۔ امید ہے اہل علم ان گزارشات کی طرف متوجہ ہوں گے۔

یا اللہ!

یا اللہ!

ہماری اسٹیبلشمنٹ کو توفیق عطا فرما کہ وہ اپنی آئینی ذمہ داریوں تک محدود رہے۔ وہ بادشاہ گری، حبّ اقتدار اور مخالفوں پر ظلم وستم سے باز رہے۔

یا اللہ!

ہمارے سیاستدانوں کو ہدایت دے کہ وہ حبّ جاہ ومال کے چنگل سے باہر آسکیں۔ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہ دیں۔ عامۃ المسلمین کے لیے مخلص اور ہمدرد بن جائیں۔

یا اللہ!

ہمارے علماء کرام اور دینی جماعتوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت سے باز آجائیں۔ منتشر رہنے کی بجائے متحد ہوجائیں۔ مسلمانوں کو پکا اور سچا مسلمان بنانے کے لیے جدوجہد کریں، معاشرے کی اصلاح کریں اور پاکستان کو مثالی اسلامی ریاست بنانے کے لیے متحد ہوکر کوشش کریں۔ آمین، یارَبّ العٰلمین

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر انوار احمد بگوی[۱]

بچوں کی ابتدائی قرآنی تعلیم کے تقاضے

پاکستان کے عوام کا قرآن کے ساتھ اپنا جو تعلق ہے سو ہے مگر اولاد کی اسلامی تربیت اور تدریس قرآن کے حوالے سے ان کے ہاں عموماً تین رویے دیکھنے میں آتے ہیں:

۱۔ ناظرہ قرآن پڑھنے اور عبادت کا طریقہ سیکھنے کے لیے بچے کا سکول کے ساتھ مسجد کے درس میں داخلہ۔

۲۔ بچوں کو باقاعدہ حفظ قرآن یا صرف مولوی بنانے کے لیے اخراجات کے بغیر دینی مدرسے میں داخلہ۔

۳۔ خوشحال گھرانوں کے سکول جانے والے بچوں کو ناظرہ قرآن اور نماز کی تعلیم کے لیے گھر پر باتنخواہ قاری کا انتظام۔

پہلے رویے کا تعلق معاشرے کی لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ بچہ عام طور پر مفت میں قرآن کی تعلیم اور نماز کی تربیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ سکول کی تعلیم بعد میں بھی جاری رہتی ہے۔ دوسرے رویے کا تعلق معاشرے کے نچلے یا غریب طبقے سے ہے۔ اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کا بچہ مفت میں پل جاتا ہے اور آئندہ معاش کے لیے روزگار کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مہتمم کا کاروبار بھی قائم رہتا ہے۔ تیسرے رویے کا تعلق مڈل کلاس اور اس کے ساتھ والے طبقوں سے ہے۔ انگریزی سکول کی تعلیم کے ساتھ، والدین کی محنت کے بغیر بچہ روزانہ نصف پون گھنٹے میں ابتدائی اسلامی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

تیسرا رویہ

بڑے ہونے کے بعد یا عملی زندگی میں داخلے کے بعد بچوں کا اسلام سے کیا تعلق رہ جاتا ہے، اس سے قطع نظر موضوع گفتگو اس وقت صرف تیسرا رویہ ہے جہاں کھاتے پیتے گھروں کے بچے کسی مسجد یا مدرسہ سے تعلق رکھنے والے مذہبی کارکن سے ابتدائی سالوں میں ناظرہ قرآن پڑھتے ہیں، نماز اور عربی دعائیں یاد کرتے ہیں اور اس سے نماز ادا کرنے کا طریقہ

[۱] مصنف، دانشور، چیف ایگزیکٹو منصورہ ٹیچنگ ہسپتال، لاہور

سیکھتے ہیں۔ اکثر مدرسین کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ گھر والوں کے مزاج یا اپنی فرقہ ورانہ ذہنیت کے مطابق بچے کو اپنا اسلام سکھائیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ محلے کی مسجد یا قریبی مدرسے کے ایک مدرس پیدل یا بائیک پر عام طور پر عصر یا مغرب کے بعد گھروں میں آتے ہیں۔ یہ استاد پہلے بچوں کو نورانی یا قرآنی قاعدہ پھر تیسواں پارہ، اس کے بعد غالباً پہلے پارے سے ناظرہ شروع کرتے ہیں۔ وہ ہر لفظ کا جوڑ بنانا سکھاتے اور رواں آیت پڑھنے کی مہارت پیدا کرتے ہیں۔ قراءت یا تجوید پر کوئی زور نہیں دیتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ استاد کلمے، نماز یاد کراتے اور اسے ادا کرنے کے طریقے سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ بعض مدرس عربی دعاؤں کے ساتھ نماز کا اردو ترجمہ بھی یاد کراتے ہیں۔

شام کو جب قرآن کلاس کا وقت ہوتا ہے تو عام طور پر بچہ معمول کی اپنی کسی سرگرمی میں مصروف ہوتا ہے۔ مین گیٹ کی گھنٹی بجنے کے کچھ دیر بعد بچے گھر کے ڈرائنگ روم میں آرام سے آتے ہیں جب وہاں استاد انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن کے احترام کے طور پر بچے اپنی ننگی ٹانگوں پر کپڑا رکھ لیتے ہیں اور بچیاں سر پر دوپٹہ نما کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ یوں مذہبی تعلیم کے لیے ایک مصنوعی مذہبی ماحول پیدا کیا جاتا ہے جس میں قرآن کی اور نماز کی تعلیم دی جاتی ہے۔

والدین کی مانیٹرنگ اور عمومی آگاہی کے سبب اب گھر کی تدریس میں مار کٹائی تو نہیں ہوتی مگر یہ استاد اکثر خود کندۂ ناتراش ہوتے ہیں۔ اکثر کا لب ولہجہ دیہاتی اور درشت ہوتا ہے جنہیں پڑھانے اور تدریس کے اسلوب سے آگاہی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ تعلیم زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ جب گھریلو کورس ختم ہوتا ہے یعنی بچہ ناظرہ قرآن ختم کر لیتا ہے تو اس کا قرآن، دین اور عملی اسلام سے رابطہ کٹ جاتا ہے۔ جو بچے دہرائی نہیں کرتے وہ بہت جلد زبانی یاد کیا ہوا بھول جاتے ہیں۔ اور بعض گھروں میں یہ تعلق صرف جمعہ کی نماز تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جب گھر کے چھوٹے بڑے مل کر محلے کی مسجد میں جاتے ہیں۔ اس تناظر میں سب سے اہم عنصر وہ مدرس ہے جو معمولی معاوضہ پر گھر میں جا کر بچوں کو روزانہ گنے چنے چند منٹ کے لیے قرآن پڑھاتا ہے۔ اس کو نہ خود ترجمہ قرآن آتا ہے اور نہ وہ آسانی سے اردو ترجمہ پڑھ سکتا ہے اور نہ بچے کو آیات کا مطلب یا مفہوم ہی سمجھا سکتا ہے۔ ابتدائی زندگی میں بچے کا مذہب کے ساتھ غالباً یہ پہلا اور آخری Exposure ہوتا ہے۔ سکول میں قرآن پیریڈ یا اسلامیات کی کلاس کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔

ماہنامہ ''البرہان'' لاہور مدارس اور سکولوں کے طلبہ کی اسلامی اور دینی تعلیم اور تدریس کے بارے میں مختلف جہات سے نظری اور عملی اقدام کر رہا ہے اور اس سے متعلق موضوعات پر عام طور پر ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہوا مواد موجود ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی ابتدائی قرآنی تعلیم اور اسلامی تربیت کے حوالے سے غالباً کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ضرورت ہے کہ اہل علم اور اہل رائے اس پر توجہ فرمائیں۔

تجاویز

اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

i۔ قرآن پڑھانے والے استاد کی تعلیمی اور تربیتی استعداد کا کم سے کم معیار مقرر ہونا چاہیے جو بچوں کے والدین کے علم میں ہو۔ مسجد کا مؤذن یا خادم ہونا استاد بننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

ii۔ بچوں کی گھروں پر تعلیم و تربیت کے لیے ایک مختصر کورس ترتیب دیا جائے جو مساجد اور مدرسہ کے مدرسین کو بلا معاوضہ پڑھایا جائے۔

iii۔ کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے کہ کسی معاوضے کے بغیر مدرس بننے کے خواہش مند لوگ آن لائن یا خود شامل ہو کر اس کام کو سیکھنے کے لیے وقت دیں تاکہ خود بھی مناسب سروس فراہم کرنے کے اہل ہوں اور بچوں کو بھی اس محنت سے کوئی دیر پا فائدہ پہنچے۔

iv۔ تربیت یافتہ مدرسین کو اسناد دی جائیں اور ہر شہر کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں یا آن لائن یہ فہرستیں دستیاب ہوں۔

v۔ قرآن پڑھانے والے ان مدرسوں کے مشاہرے یا اعزازیہ کے لیے بھی کم از کم حد تجویز کرنی چاہیے۔ وہ لوگ کم تنخواہ پانے والوں میں سے ہوتے ہیں اور معاشرے کو ایک دینی خدمت فراہم کر رہے اور اپنا وقت اور وسائل صرف کر رہے ہوتے ہیں، جس کا معقول بدل یا معاوضہ انہیں ملنا ضروری ہے۔

vi۔ تربیت میں مدرس اور شاگرد دونوں کے لیے آدابِ تدریس بھی شامل کیے جائیں۔ یہ آداب والدین کے علم میں بھی ہونے چاہئیں۔

تعلیم و تربیت		انتخاب: عابد چوہدری

بچوں کے موبائل کی نگرانی کیجیے

موبائل فون کے غلط استعمال سے اپنے بچوں کو بچائیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں سے فائدہ اٹھائیں۔

پلے اسٹور سے Google Family Link for Parents نامی ایپ کو ڈاؤنلوڈ کریں۔ مِن وعَن ایپ اپنے بچے کے موبائل میں بھی ڈاؤنلوڈ کریں۔ دونوں ایپ کو ایک ساتھ اوپن کریں۔ اپنے موبائل کو نگران (سپروائزر) قرار دیں۔ پھر جو ہدایات ملیں ان کو مرحلہ وار فالو کریں۔ اس ایپ کا فائدہ یہ ہے کہ آپ اپنے بچے کی موبائل سرگرمیوں سے متعلق حسب ذیل باتوں سے کسی بھی وقت آگاہ ہو سکتے ہیں:

۱۔ اس نے کس ویب سائٹ کو اوپن کیا؟		۲۔ کس ویڈیو کو دیکھا؟

۳۔ دن بھر کتنی دیر وہ موبائل کے ساتھ چمٹا رہا؟

نیز ایک اور فائدہ اس ایپ کا یہ ہے کہ جب کبھی آپ کا بیٹا کوئی گیم/ ایپ ڈاؤنلوڈ کرنے لگے گا یا کسی بھی ویب سائٹ کو دیکھنے یا access کرنے کی کوشش کرے گا تو براؤزر پہلے آپ سے اجازت مانگے گا۔ غرض آپ جن ویڈیوز اور گیمز کی اجازت دیں گے آپ کا بچہ وہی ویڈیو یا گیم یا ویب سائٹ access کر سکتا ہے۔

نیز آپ جب چاہے، کسی گیم یا ایپ کو جو آپ کے بچے کے موبائل میں ہے، بلاک کر سکتے ہیں جو آپ کے بچے کے موبائل سے غائب ہو جائے گا۔ جب تک آپ کی اجازت نہیں ہو گی وہ نہیں کھول سکے گا۔ اسی طرح اپنے کروم براؤزر میں جا کر setting میں جائیں اور safe search filter میں جائیں اور Filter exlicit results کو select کریں۔ اسی طرح ویڈیو میں Do not Autoplay کو select کریں۔

اسی طرح پلے اسٹور میں جائیں، setting میں جائیں اور parental controls کو آن کریں۔ امید ہے اتنا کرنے سے آپ اور آپ کے بچے کا موبائل نامناسب مواد سے پاک ہو جائے گا، ان شاءاللہ۔"

تعلیم و تربیت

پروفیسر عاصم حفیظ

سندھ بھر میں میوزک کلاسوں کا اجراء

علم نہیں، گانا سیکھیں

سندھ کے 31 اضلاع کے سرکاری اسکولوں میں 750 میوزک ٹیچرز کی بھرتیوں کا آغاز ہوگیا ہے۔ میوزک ٹیچر کو بی ایس 14 میں بھرتی کیا جارہا ہے، ٹیچر ہارمونیم، وائلن، فلیوٹ، باجا، پیانو، ڈفلی بجانا سکھائیں گے۔

موسیقی کے اساتذہ کی بھرتی ضلعی سطح پر ہورہی ہے۔ مستقبل میں اچھی کارکردگی کی بنیاد پر ان اساتذہ کو مستقل کردیا جائے گا۔ محکمۂ تعلیم کے مطابق میوزک ٹیچرز طلبا کو گروم کریں گے اور اس ٹرینڈ کے ساتھ سرکاری تعلیمی ادارے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گے۔ پہلے مرحلے میں بھرتیاں ہورہی ہیں پھر جدید آلات موسیقی لیے جائیں گے۔

یہ تھی خبر سندھ سرکار کی جو تعلیم میں جدت میوزک کے ذریعے لارہی ہے۔ دنیا بھر میں سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے جدت آتی ہے۔ سندھ سرکار ناچ گانے سے جدت لارہی ہے

دوسری جانب حکومت مہنگائی کرتے وقت اور بجلی پیٹرول کی قیمتیں بڑھاتے وقت وسائل کی کمی کا رونا روتی ہے۔ سرکاری سکولوں کی چار دیواری تک نہیں ہوتی لیکن موسیقی کے لیے خزانہ کھلا ہے۔ جہاں دیوار تک نہیں وہاں بھی گانے گائے جائیں گے۔

جن گھروں میں کھانا نہیں انہیں گانا سنا کر زندہ رکھا جائے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ پورے ملک کے لیے میوزک ٹیچرز بھرتی کرڈالے۔ جہاں مہنگائی کا مسئلہ ہو، کوئی فاقے سے مر رہا ہو، بجلی گیس پیٹرول مہنگا محسوس ہو تو فوری طور پر میوزک سنا کر رام کیا جائے۔ گانا ہی تو ضروری ہے۔ کھانا، بجلی پانی کی کیا ضرورت ہے؟

تعلیم و تربیت

محمد سلیم منہاس[۱]

فرسودہ نظامِ تعلیم کی تباہ کاریاں

ہمارا مقتدر طبقہ تعلیم کو کسی بھی سطح پر توجہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ انسان اور سیرت سازی کا یہ شعبہ ان کے لیے بالکل بے معنی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام خود رو جنگل کی طرح پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے۔

تعلیمی پالیسیاں مرتب کرنے والے نام نہاد ماہرین تعلیم، تعلیم کی اہمیت اور اس میں موجود قوتِ عمل سے نابلد ہیں بلکہ قوم کی ترقی میں تعلیم کے کردار کو سرے سے جانتے ہی نہیں۔ یہ نہ تو تعمیر سیرت کے مفہوم کو جانتے ہیں اور نہ ہی مستقبل کے چیلنجز کو۔

کیا ہم نے اس جانب کبھی غور کیا ہے کہ وہ معیارات کیا ہیں جن پر ہم نسل نو کے کردار کی بنیاد رکھیں؟ کیا ہم آئندہ ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کو اس معاشی اور سماجی مردہ نظام کے سپرد کریں گے جو خود رو جڑی بوٹیوں کی طرح سر اٹھاتے رہیں اور زمانے کے حوادث سے مار کھا کر، شکست وریخت کا شکار ہوتے رہیں؟

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے سے جو بلا طلب مواد ذہنی افلاس کی طرف لے کر جا رہا ہے اور عقل و دانش سے بے بہرہ کر رہا ہے، کیا اس پر مقتدر طبقے اور داعیانِ حق خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں گے؟

مغربی نظام تعلیم کو اپنا کر اس قوم نے اپنی انفرادیت اور اجتماعیت کو بکھیر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے خیالات وتصورات انتشار کا شکار ہیں۔ اپنے وسیع نظام تعلیم کو غیر موثر اور کمزور سمجھتے ہوئے ترک کر دیا ہے اور مغربی نظام تعلیم سے اپنی نظروں کو خیرہ کر لیا ہے۔ حالانکہ اقبال نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ؎

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

---

[۱] ڈائریکٹر نافع (نیشنل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشن پاکستان)، گوجرانوالہ

یہ عصرِ حاضر کا بہت بڑا چیلنج ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اس نظام تعلیم کی نقالی اور جعلی افکار ونظریات کی موجودگی میں خود کو اپنے ہی ممالک اور تہذیب وتمدن میں بیگانہ تصور کر رہی ہے۔ اور یہ کہ مقتدر طبقہ کے علاوہ سرمایہ دار بھی اس فرسودہ نظام سے مغلوب ہو کر اس پر قناعت کیے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے کثیر سرمایہ لگا کر مغربی نظام تعلیم کی طرز پر تعلیمی ادارے بنا ڈالے ہیں کہ یہاں سے باہر اور کچھ نہیں۔ خطیر وکثیر سرمایہ کاری کر کے تعلیم کو صنعت میں رول کے رکھ دیا ہے اور تعلیمی ادارے کا ماحول کلیتاً مغربی طرز کا بنا دیا گیا ہے۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ فی میل سٹاف کا چناؤ ہی Presentable ہونے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اور ایک ماڈل گرل کے طور پر بچوں کے والدین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اس طرح جدید تعلیم کے جھانسے میں آ کر ہم نے ایک ادھورے اور نامکمل نظام تعلیم کو اپنا لیا ہے جس نے ہر لحاظ سے ہماری اقدار وروایات کی جڑیں کاٹ ڈالی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس وقت ہمارے تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ وطالبات فکری اور عملی طور پر مسلمان کی صفات سے خالی ہیں اور تکنیکی اور فنی اعتبار سے بھی کوئی کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دے پا رہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کی بات کرنے والے کو پس ماندہ سوچ کا مالک، غیر مہذب اور جاہل ٹھہرایا جاتا ہے اور قرون اولیٰ کی تاریکیوں میں واپس لے جانے والا تنگ نظر اور وحشی قرار دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں قرآن کی تعلیم پر توجہ دلانے والا دہشت گرد اور قرآنی تعلیم کو دہشت گردی قرار دے دیا گیا ہے (جس کی دلیل میں قرآن میں موجود جہادی آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے)۔

یہ انہی رویوں کا نتیجہ ہے کہ تعلیمی ادارے نہ صرف اسلامی اقدار سے بیگانہ ہو چکے ہیں بلکہ کچھ اور آگے بڑھ کر عریانی اور فحاشی کے مراکز میں تبدیل ہو چکے ہیں جن میں نجی اور سرکاری تعلیمی ادارے برابر کے شریک ہیں۔ سرکاری اداروں میں عجب تماشہ کیا جا رہا ہے کہ مردانہ تعلیمی اداروں میں زنانہ سٹاف اور زنانہ تعلیمی اداروں میں مردانہ سٹاف بھرتی کیا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ مخلوط نظام تعلیم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ نجی تعلیمی اداروں میں پری پرائمری سے لے کر میٹرک، انٹر، ڈگری کالجز یونیورسٹیز تک مکمل طور پر مخلوط تعلیم ہے۔ سٹاف بھی مخلوط ہے۔

کوئی روک ٹوک نہیں......نہ اساتذہ کے لیے نہ طلبہ وطالبات کے لیے۔ جہاں پٹرول اورآگ کو اکٹھا کر دیا جائے وہاں سے تعلیم کے گلوں کی خوشبو کی توقع رکھنا حماقت سے کم نہیں۔ایسے ماحول سے تو آگ کے شعلے ہی بلند ہوں گے جو اس پورے نظام تہذیب وتمدن کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔

اس کی زندہ مثال اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی ہے کہ جس میں اُستاد اور شاگرد کے رشتے کو ایسے پامال کیا گیا ہے کہ وحشت بھی شرما جائے۔مختلف سمعی بصری چینلز اور سوشل میڈیا ذرائع کے مطابق اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں منشیات کے استعمال اور جنسی استحصال کا انکشاف ہوا ہے جو پاکستان کی تاریخ کا ایک بڑا نازیبا حرکات کا وڈیو سکینڈل ہے۔

یہاں صرف ایک یونیورسٹی کے حالات ایسے نہیں ہیں بلکہ ایسے سرکاری تعلیمی ادارے جہاں مخلوط تعلیم ہے یا جہاں مردانہ تعلیمی اداروں میں زنانہ سٹاف لگایا گیا ہے اور زنانہ تعلیمی اداروں میں مردانہ سٹاف بھرتی کیا گیا ہے، ہر جگہ ایسے مسائل موجود ہیں، بلکہ زنانہ تعلیمی ادروں میں جو سپروائزر یا AEDO تا DEO مردانہ سٹاف لگایا جاتا ہے وہاں پر بھی ایسے ہی ماحول کو شکوک وشبہات کا شکار بنا دیا گیا ہے۔

نجی تعلیمی اداروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں تو کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا۔ جتنے مہنگے ادارے اتنی ہی زیادہ بے حیائی اور فحش ماحول پایا جاتا ہے۔ یہاں ڈگریاں قابلیت کی بنیاد پر نہیں دی جاتیں اور نہ ہی روپوں کے مول بکتی ہیں بلکہ ان ڈگریوں کی قیمت تو نازیبا حرکات جیسے مکروہ اور قابل شرم عمل اور عصمت دری جیسے قبیح اور حرام کام کے ساتھ ساتھ زنا بالجبر کا شکار ہو کر ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہاں قابلیت اور صلاحیت کا نام ونشان دور دور تک نظر نہیں آرہا۔رہ گئی صالحیت تو اس کا جنازہ تو ان مکروہ عوامل سے پہلے ہی نکال دیا گیا تھا۔

ایسے گھناؤنے کردار والے اساتذہ کی زیرنگرانی تیار ہونے والی نسل نو آگے ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھالے گی تو یہ بیوروکریسی ملک میں کرپشن اور حیا سوز ماحول کو ہی رواج دے پائے گی کیونکہ ان کی تربیت ہی انہی بنیادوں پر کی گئی ہے اور ایسے افراد قومی اداروں کو کامیابی وکامرانی کے ساتھ چلانے کی بجائے تباہ وبرباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ کام کرنا تو سیکھا ہی نہیں ہوتا ان سے صالحیت اور صلاحیت کا تصور رکھنا سرے سے عبث اور بے کار ہے۔(بقیہ صفحہ نمبر: ۳۳)

تفہیم دین/مکالمہ ادارہ

پاکستان میں غلبۂ دین کا متبادل لائحہ عمل

ہمارے مضمون پر قارئین کے تبصرے

رضی الدین سیّد (کراچی)

راقم کو آپ کی اور آپ جیسے ہم خیال دانشوران کی گفتگو اور تحریریں پڑھتے رہنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ نفاذِ اسلام کے نفاذ کے لیے جو طریقۂ کار آپ صاحبان ہمارے قدیم ادوار سے اخذ کرتے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ شاید آپ کے ذہن میں تب یہ نہیں رہتا کہ جدید دور میں انتخابات ہی تبدیلیٔ نظام کا واحد راستہ رہ گئے ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی حیاتِ مستقبل کے بارے میں رائے دہی کرتے ہیں۔ کس نظام کو وہ اپنے ملک اور زندگی کے لیے پسند کرتے ہیں اور کن شخصیات کو اس نظام کے لیے منتخب کرتے ہیں؟ کے جواب ہی سے وہ ملک کا نظام طے کرتے ہیں۔ یہی وہ مروجہ راستہ ہے جس سے ان کے مستقبل کا تعین ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل بھی طے کرتے ہیں۔

گزشتہ ادوار میں چونکہ یہ اصطلاحیں اور یہ رواجات، رائج الوقت چلن نہیں تھے، اس لیے ملک کے لوگوں کے لیے چند منتخب شخصیات ہی سارا نظام طے کرتی تھیں جو عمومی طور پر بادشاہت ہی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے بھی اور غیر مسلموں کے لیے بھی۔ اگرچہ مسلم حکومتوں میں اسے خلافت کے پردے میں چھپا دیا جاتا تھا۔ ان حکومتوں میں آپس میں تو خانہ جنگیاں خوب ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے سر بھی کاٹے جاتے تھے لیکن عوام تک ان کے گھناؤنے اثرات نہیں پہنچ پاتے تھے۔ تمام لڑائیاں محض ایوان اقتدار ہی کے اندر ہوتی تھیں۔

تاہم عام زندگی میں حکومتی معاملات میں شریعت کی جھلکیاں ضرور موجود پائی جاتی تھیں۔ عدل وانصاف کم وبیش بہتر تھا اور تحریر وتقریر پر پابندی کا کوئی سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ ماسوا چند جید دینی شخصیات کے جنہیں ہم حکومتی معاملات پر برملا تنقید، یا حکومت کے خلاف

جنگ کی وجہ سے، محدود طور پر، سیاسی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب جمہوریت ہی نہیں ہوگی تو گندی اور ہمہ پہلو برباد کردینے والی سیاست بھی نہیں ہوگی۔ نتیجے میں بقول بعض مفکروں کے ''نہ تو قومی ریاست'' کا تصور ابھرے گا اور نہ کوئی ''ملک دشمنی'' کی اصطلاح سامنے آئے گی۔ پس سارا مخمصہ ہی اصل میں انتخابی جمہوریت کا ہے۔

ترقی یافتہ دنیا کے لیے تو یہ جمہوریت، کئی لحاظ سے نعمت ثابت ہوئی ہے اور اسی سیاست کے نتیجے میں یہ ممالک درجہ بدرجہ ترقی بھی کرتے رہے اور مضبوط بھی ہوتے رہے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے عالمی طاقت کی حیثیت بھی اختیار کر لی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے تیسری دنیا، بشمول غیر مسلم ریاستوں میں یہ جمہوریت ایک تماشہ اور ایک مذاق ہی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ مافیاؤں اور طاقتور اشرافیہ کے ہاتھوں کی کنجی بن گئی ہے بلکہ تیسری دنیا تو بیشتر فوجی اقتدار کے شکنجوں ہی میں کسی رہی ہے۔

ایشیائی عرب ممالک جہاں ریاست کے کاروبار سے عام آدمیوں کا کچھ لینا دینا نہیں، وہاں کے عوام کی معاشی حالت تقریباً قابل رشک نظر آتی ہے لیکن قابض شاہی طبقہ وہاں بھی صرف مغرب کی غلامی ہی میں مگن رہتا اور مکے مدینے کی بجائے واشنگٹن اور لندن کی جانب دماغ رکھتا ہے جس کے باعث ان ممالک کی حیثیت بھی شرعی کی بجائے غیر شرعی ہی ہے۔ یوں مسلم ممالک میں نہ انتخابی جمہوریت کارفرما ہے اور نہ شاہی طرز حکومت سے دینی نظریے ہی کو کوئی فیض پہنچ رہا ہے۔

سو بات اصل میں مقتدر طبقے کے مزاج کی ہے جو خواہ نام نہاد جمہوریت کے نتیجے میں حکومت سنبھالے ہو یا خاندانی شاہی اطوار سے ملک پر قابض ہو۔ اور یہ طبقہ خصوصاً، کسی بھی لحاظ سے شرعی نہیں ہے۔ دین کو وہ دوسرے نہیں، تیسرے نمبر پر رکھتا ہے جس کا اصل سبب اس طبقے کی یونیورسٹی و بیرونی تعلیم و تربیت ہے۔

البتہ موجودہ زہریلی جمہوریت کے باوجود دو مسلم ممالک بہرحال اس صورت حال سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک ترکی اور دوسرا ایران۔ خصوصاً ترکی میں تو مقتدر حکومتی طبقے کی یہ دینی حس اور حکمت عملی ہی ہے جس کے باعث وہاں اسلام درجہ بدرجہ مضبوط ہوتا نظر آ رہا ہے۔ ادھر ایران

میں بھی پے درپے منعقد ہونے والے انتخابات کے باوجود اپنے لحاظ سے وہاں کے حکمران، اپنی فقہ کو کارفرما کئے ہوئے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت سے اچھے اور مفید پھل بھی کشید کئے جاسکتے ہیں۔

آج کا دور وہ ہے جس میں عوام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا ہے کہ ملک کا اقتدار و انصرام آپ کی اپنی رائے ہی سے تشکیل پائے گا۔اس لیے عوام بھی اب اسی جذبے سے سرشار رہتے ہیں کہ اپنے قائدین کے انتخاب کا حق انہیں لازماً ملنا چاہیئے۔اور اگر نہ دیا جائے تو جبری قابض طبقے کے خلاف، بغاوت واجب اور خروج جائز ہے۔

سو ایسی عوامی سوچ میں ہم بہت پیچھے جا کے کیسے وہ نظام اپنا سکتے ہیں جب ایوان حکومت کے تمام امور محض چند بڑی سنجیدہ شخصیات کے فیصلوں میں مرتکز ہوتے تھے اور حکمرانوں کا نصب وعزل انہی کے ہاتھوں میں ہوتا تھا، عوام کو جس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا؟

آج کے حالات کا درست جائزہ لینے کی خاطر لازم ہے کہ ہمارے ذہنوں میں واضح رہے کہ انتخابی سیاست ہی اب لوگوں کا نشہ اور دورِ موجودہ کا ناقابل تنسیخ رواج ہے۔

صدارتی نظام سیاست کسی حد تک ہمارے سابقہ نظام سے مماثلت رکھتا ہے لیکن اس میں بھی ہم نے تجربہ کیا کہ وہی آمریت، وہی لادینیت، وہی بیرونی غلامی اور وہی خاندانی سیاست گتھی ہوئی تھی۔

ایسے ہر موقع پر علامہ اقبال بے ساختہ یاد آتے ہیں جب وہ فیصلہ کن طور پر کہہ گئے تھے کہ ۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے

تو اگر جلال بادشاہی یا سیاست میں دین داخل کر دیا جائے تو چنگیزیت ازخود ہی غائب ہو جائے گی۔مگر یہ مرحلہ سر کیسے ہو؟ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ جماعت اسلامی بہرحال اسی جانب یکسوئی سے جدوجہد کر رہی ہے۔ بلکہ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ اگر افغانستان کی موجودہ ریاست اسلامیہ بھی انتخابی سیاست میں داخل ہو جائے تو اپنی گندی فطرت سے، یہ سیاست وہاں بھی درجہ بدرجہ وہی گل کھلانے لگ جائے گی جو ہم تیسری دنیا، خصوصاً پاکستان میں دیکھ

رہے ہیں کہ بجائے بہتر ہونے کے یہ مزید بدتر اور تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ تاہم تمام تجزیے کے باوجود بات وہی ہے کہ موجودہ دور میں انتخابی جمہوریت میں داخل ہوئے بغیر ہمارے لیے کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔

تصور حسین (حافظ آباد)

* راقم کے نزدیک بھی وہ اسلامی تحریکیں جو جمہوری انتخابات کے ذریعے تبدیلی کی بنیاد پر کام کر رہی ہیں، ان کی اس جدوجہد کے نتیجے میں کبھی نظام کو شریعت کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔

* اگر آپ کی رائے کو ایک لفظ میں سمویا جائے جو آپ کے موقف کا احاطہ کرے، تو وہ لفظ ہے دعوت۔ دعوت دیں انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر عملی اقدامات کریں۔

* جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس کام کو کرنے کے لیے بھی ایک مستقل دعوت کی ضرورت ہے جو کہ ایک الگ جماعت کی صورت میں کیا گیا تو یہ کام بھی باقی جماعتوں کی طرح ایک نظمی ترتیب اختیار کر لے گا اور نتیجے کے اعتبار سے سوائے چند ہم خیال افراد کے گروپ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

* مولانا الیاسؒ کی فکر پر دعوت وتبلیغ کا کام بہت اچھے نتائج دے رہا ہے لیکن نظام کی تبدیلی چونکہ ان کی فکر میں شامل نہیں اس لیے نظامِ خلافت کی فکر سے وابستہ لوگ اس ترتیب پر کام کرنے کو ترجیح نہیں دیتے۔

* تنظیم اسلامی چونکہ سیاست کی بنیاد پر نظام خلافت کی داعی جماعت نہیں ہے لیکن اس فکر کے داعی انفرادی سطح کی دعوت کے لیے بہت اچھے اصول اپنائے ہوئے ہے۔

* ولی اللّٰہی جماعت شریعت، سیاست وتزکیہ کی بنیاد پر نظامِ خلافت کی داعی جماعت ہے۔

آپ مذکورہ بالا جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقات کے بعد اپنی فکر کو ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے عملی اقدامات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

پروفیسر عبدالخالق سہریانی بلوچ (کندھ کوٹ، سندھ)

البرہان کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس میں شائع شدہ آپ کا تفصیلی مقالہ ''نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج کیا ہے؟'' نظر سے گزرا۔ آپ نے ایک اہم موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا ہے، امید ہے قارئین ''البرہان'' اس پر اپنے خیالات اور آراء کا اظہار فرمائیں گے۔

آپ کے مقالہ میں پیش کردہ نظریات اور تجاویز سے نہ تو کلی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے نہ انہیں کلیۃً ردّ کیا جاسکتا ہے۔ سرِ دست چند امور کے بارے میں گزارشات پیش خدمت کر رہا ہوں۔

۱۔ آپ نے آئین پاکستان کی اس شق کو جو پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے متعلق ہے آئین میں درج ''پالیسی کے اصول'' کی دفعات میں شمار فرمایا ہے۔ یہ دفعات آئین کے آرٹیکل 8 سے لے کر 40 تک تحریر شدہ ہیں۔ ان میں پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا کوئی ذکر نہیں ہے اصل میں دفعہ 227 ہے جو آئین کی مؤثر دفعات میں شامل ہے۔ ان دفعات پر آج تک عمل نہیں کیا گیا۔ میرے نزدیک ان دفعات کی خلاف ورزی ''سنگین غداری'' کے جرم سے کم نہیں۔ اس موضوع پر ایک تحریر ارسال خدمت کروں گا اس پر اپنی رائے سے مشرف فرمائیں۔

۲۔ خلافت راشدہ کے بعد رائج ''ملوکی نظام'' کے بارہ سو سالہ دور میں رائج نظام فقہ وفتاویٰ کو جو خالصۃً پرائیویٹ تھا آپ نے اس کو اسلامی نظام کا ریاستی نظام کا حصہ قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اس کی حیثیت مسلم پرسنل لاء (Muslim Persoanal Law) کی تھی جو علماء کرام کے شخصی انتظام کے تحت رائج تھا۔

ریاست کے اہم اور بنیادی قوانین جن کا تعلق حکمرانی اور سیاسی و مالی معاملات سے تھا علماء کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ اس میں مداخلت کر سکتے تھے۔ قاضی القضاۃ کا تقرر حکومت کرتی تھی جو اس کے حق میں فیصلے دیا کرتا تھا، اس لیے امام ابوحنیفہؒ نے قاضی القضاۃ بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ۱۲ سالہ دور کو اسلامی نظام (خلافت علی منہاج النبوت) کے نظام عدل کا تسلسل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

(۲)

آپ نے اپنے مقالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''ہم نفاذ شریعت اور غلبہ دین کے لیے سیاسی

جدوجہد کے منکر نہیں ہیں، ہم اس کی ضرورت اور اہمیت کے قائل ہیں۔''(البرہان ستمبر صفحہ ۲۸) لیکن اس کے بعد آپ نے جمہوری طریقہ سے تبدیلی کو ناممکن قرار دیا ہے۔اس کے ساتھ آپ نے اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے ۵ شرائط/طریقے تجویز فرمائے ہیں جن پر عمل کرنے سے دس سالہ مدت میں دینی قوتوں کا پریشر گروپ اپنے مطالبات منوا سکے گا، اس طریقۂ عمل سے ایک''سافٹ انقلاب'' برپا ہوگا اور پریشر گروپ برسر اقتدار آجائے گا اور پاکستان ایک طاقت ور اسلامی ریاست کے طور پر ابھر سکتا ہے۔

آپ کا سابقہ نقطۂ نظر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ پر مبنی تھا، آپ کا موجودہ مؤقف فکری ارتقا کا مظہر ہے۔

آپ نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو پانچ اصول تجویز فرمائے ہیں وہ پاکستان کے موجودہ حالات اور سیاسی اور دینی جماعتوں کے طریقہ کار کے ماحول میں قابل قبول اور قابل عمل ثابت ہو سکتے ہیں؟ مجوزہ تجاویز پر عمل کرنے کے لیے کیا کوئی داخلی نظم قائم کیا جا سکتا ہے جو ان کو روبکار لا سکے؟

اگر اس طرح کی کوئی تحریک برپا ہو جائے تو کیا پاکستان کی سیکولر لابی اسے برداشت کرے گی؟ اسے ناکام بنانے کے لیے جدوجہد نہیں کرے گی؟

آپ نے''سافٹ انقلاب'' برپا ہونے کا عندیہ دیا ہے، اس کے بارے میں تفصیلات کا ذکر نہیں فرمایا، اگر اس کی تفصیلات کے بارے میں آگاہی دیں تو ان پر بھی غور ہوگا کہ وہ کہاں تک کامیابی کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہیں۔موہوم تجاویز سے ذہنی انتشار پیدا ہوگا۔

پاکستان میں نظام کی تبدیلی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مؤثر طریقہ کار استعمال کرنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے ساتھ ہم دوسرے طریقہ ہائے کار خصوصاً ایران میں اسلامی نظام کے قیام کی پرامن غیر مسلح جدوجہد کو سامنے رکھنے میں کیوں احتراز کرتے نظر آتے ہیں؟ کیا ان کا طریقہ غیر جمہوری تھا؟ دنیا نے اس انقلاب کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت کو کیوں تسلیم (قبول) کر لیا؟ امید ہے ہے آپ ان چند ناقص معروضات پر غور فرما کر رہنمائی فرمائیں گے۔

فہم دین　　　ڈاکٹر ابصار احمد [۱]

عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ

دینی جماعتیں مغرب کی تحریک آزادئ نسواں سے متاثر ہو رہی ہیں

’الخدمت‘ اور جماعت اسلامی کی قیادت کی توجہ کے لیے

پچھلے دنوں ’الخدمت فاؤنڈیشن‘ کے زیر انتظام ’’بنو قابل‘‘ پروگرام کے تحت منعقدہ بچیوں (میٹرک اور اس سے اوپر تعلیم یافتہ) کے لیے آئی ٹی ٹریننگ کورسز کے لیے ٹیسٹ میں شہر بھر سے نوجوان لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پورے کراچی اور مضافات میں ’’بنو قابل‘‘ اور ’’کراچی کی بیٹیو‘ پڑھو‘ آگے بڑھو‘ کے نعروں پر مبنی اس ٹیسٹ کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ چنانچہ پچاس ہزار طالبات نے ٹیسٹ کے لیے رجسٹریشن کروائی اور ہزاروں پر مشتمل جم غفیر نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ امیر جماعت اسلامی کراچی حافظ نعیم الرحمٰن اور ان کے معاونین‘ معروف تعلیمی اداروں اور پیشہ ور افراد کے علاوہ کئی ٹی وی آرٹسٹ اور اینکر پرسنز کے ساتھ ’’بنو قابل میگا پروجیکٹ‘‘ کے اس پروگرام میں کنٹینروں پر قائم کیے گئے وسیع سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کراچی کو ملک اور خطے کی ایک اہم انفارمیشن ٹیکنالوجی سٹی بنانے کے عزم اور شہر میں IT یونیورسٹی کے قیام کو یقینی بنانے کا اظہار بھی فرمایا۔ کراچی کے لڑکے اور لڑکیوں کے بعد اب وہ گھریلو خواتین کی فنی تعلیم کے لیے بھی پروگرام بنا رہے ہیں اور ان کو بھی آئی ٹی کورس کروانے کا اعلان کیا۔ سٹیج پر انٹرٹینمنٹ شخصیات‘ اہم بزنس اور سوشل influencers کا جمگھٹا تھا جو ظاہر ہے طالبات کو متأثر کرنے اور ان کا ذوق وشوق بڑھانے کے لیے تھا۔ اس پورے پراجیکٹ کے حوالے سے معروف اینکر خاتون شائستہ لودھی کو الخدمت کی سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ کامیاب طالبات کو چار سے چھ ماہ مدّت کے مختلف آئی ٹی کورس مفت کروائے جائیں گے اور پھر جماعت اور الخدمت ملازمت کی تلاش میں بھی مدد فراہم کریں گی۔ موقر انگریزی اخبارات نے بالخصوص بڑے سائز کی تصاویر کے

---

[۱] سابق صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب، مدیر سہ ماہی ’حکمت قرآن‘ لاہور (برادر خورد ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم)

ساتھ اس اہم پروگرام کی کوریج کی۔ طالبات سے ایک عہد بھی لیا گیا جس کے دو جملے قابلِ ذکر ہیں: ''پاکستان اور اس کے اسلامی نظریے کی وفادار رہوں گی .... اپنے اخلاق و کردار سے خاندان اور ملک وملّت کی عزت میں اضافے کا سبب بنوں گی۔'' جماعت اسلامی اسلام آباد کی اہم شخصیت میاں محمد اسلم نے بھی کراچی کی طرح پچاس ہزار لڑکے لڑکیوں کو عالمی معیار کی بہترین IT ٹریننگ سے گزار کر پروفیشنل ڈویلپمنٹ کے لیے تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مؤسسہ جماعت اسلامی کو پاکستان کے اسلامی سیکٹر میں امکانات کے لحاظ سے یہاں کے سب سے زیادہ باوسائل اور سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے گروہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مؤسس جماعت کے خلاق ذہن، عام فہم نثر، غیر معمولی لسانی شعور کے ساتھ ادبیت اور قرآن وسُنّت سے علمی وانجذابی وابستگی نے وقیع وشاندار علمی دینی لٹریچر اور تفسیر قرآن میں ظہور کر کے لاتعداد خواتین وحضرات کو اسلام کی حقیقت سے روشناس کرایا۔ ان کی زندگیوں میں ایمان ویقین کی جوت جگا کر شروع کے عشروں میں بڑی تبدیلی برپا کی۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تحریکی جماعتی مساعی کے ذریعے اپنے قارئین اور سامعین کے ذہن میں یہ بات پختگی کے ساتھ بٹھائی کہ ہر قوم اور تہذیب کا طرزِ زیست اس کے تصوّرِ حقیقتِ اعلیٰ یعنی عقیدۂ الہٰ، تصوّرِ انسان اور تصوّرِ کائنات کے تابع ہوتا ہے۔ دنیا کی زندگی عارضی ہے اور موت ہر فرد کے لیے وقت مقررہ پر آ کر اسے ایک دوسرے جہان میں منتقل کر دینے والی ہے جہاں اس کے ایمان اور اعمال کا محاسبہ ہوگا۔

کلام اللہ کا ہر صفحہ دین اسلام کے اس بنیادی مقدّمے کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کر کے انسانوں کو مریدِ دنیا اور مریدِ آخرت کے دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے: ﴿مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ﴾ (آلِ عمران: ۱۵۲)۔ چنانچہ دین کی حقیقت پوری زندگی اور ہمہ جہت آئینِ بندگی ہے۔ اس پورے تناظر میں اصل، حقیقی اور نافع علم وہ 'العِلم' ہے جو وحی پر مبنی ہے یعنی ما قال اللہُ وقال الرَّسول۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے کلام اللہ اور سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم بنیادی اہمیت کا حامل ہے جو ہماری انفرادی واجتماعی ہر قسم کی اَقدار، اَہداف اور اَخلاق وروحانی تحرک کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ ایمان وعمل کے اس عظیم دعوتی

اور ربانی فہم کو توسیع دینے اور عمومی بنانے کے لیے ضروری خیال کیا گیا کہ ہر جگہ تذکیر بالقرآن‘ سیرتِ نبوی ﷺ اور اُسوۂ صحابہ کرامؓ کے سنجیدہ دعوتی و تربیتی حلقے قائم کیے جائیں‘ کیونکہ نبی مکرم ﷺ کی سُنّت اور اَتقیاء و صلحاء کی سیرت سے بڑھ کر کوئی فلسفہ و فکر اور آئیڈیالوجی نہیں جو انسانیت کے لیے حیات بخش ثابت ہو۔ مولانا مودودیؒ کی فکر کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ خدا پرستی اور اتباعِ رسول ﷺ پر مبنی دینی و روحانی کلچر وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ مولانا مودودیؒ کے فکر شہادتِ حق علی الناس اور غلبۂ دین سے انسپریشن لے کر بانی تنظیم اسلامی اور مؤسس انجمن خدّام القرآن برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے پاکستان کے طول وعرض اور کئی بیرونی ممالک میں دروسِ قرآنی کے ذریعے ’’رجوع الی القرآن‘‘ کے عنوان سے پانچ چھ دہائیوں کے دوران شدید محنت کر کے عوام کی سطح پر اور تعلیم یافتہ حضرات وخواتین میں بھی مسلم شناخت کی حقیقی معنویت اور قرآن وسُنّت کے حوالے سے مسلمانوں کے فرائض کا شعور پیدا کیا۔

راقم کا خیال تھا (اور خواہش بھی!) کہ جماعت کے کثیر الاشاعت ہفتہ وار ’’فرائیڈے اسپیشل‘‘ میں جناب شاہنواز فاروقی صاحب جو نظریاتی طور پر ایک باریک بین اور نکتہ شناس مصنف اور علّامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ’’مردِ خبیر‘‘ ہیں‘ وہ حافظ نعیم الرحمٰن کے ’’بنو قابل‘‘ میگا پراجیکٹ اور طالبات وخواتین کی empowerment اور معاشی آسودگی وخود مختاری (جو تحریک نسواں کے نعرے ہیں) کے حوالے سے مؤسس تحریکِ اسلامی کے بنیادی اسلامی عائلی نظام کے نقیض پروگرام اور تہذیبی فکری تحولِ عظیم پر ناقدانہ تبصرہ کریں گے۔ لیکن معاملہ ؎ ’’اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!‘‘ والا ہوا۔ اس اہم پروگرام کے فوری بعد شائع ہونے والے شمارے میں فاروقی صاحب کی دو تحریریں قارئین کے مطالعے میں آئیں: ایک ’’معاشرے میں کرداری نمونوں کا بحران‘‘ کے عنوان سے اور دوسری ’’کفر تک لے جانے والی غربت‘ خودکشی تک لے جانے والا معاشی دباؤ‘‘۔ ایک دوسرے مستقل قلم کار اے اے سیّد نے اس پورے ایونٹ کی واقعاتی تفاصیل تحریر کیں۔ فاروقی صاحب نے اشارتاً بھی یہ نہیں کہا کہ یہ پورا پراجیکٹ ہمارے دینی وملّی مواقف اور روایت کی قربانی اور مغربی استعماری جدیدیت (modernity) کے عزائم کی تکمیل کا باعث بنے گا۔ عیسائی دنیا میں مارٹن لوتھر اور بعد ازاں کئی دوسرے مفکرین کے زیر اثر عیسائیت میں دین اور دنیا کی ثنویت اور دنیا پرستی پر

ارتکاز اپنی پوری شدّت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے اور عیسوی زمین سماوی ہدایت کے چشمہ فیضان سے منقطع ہو کر خالص مادّہ پرستانہ دلدل میں اتر گئی۔ یورپ نے حلال وحرام کی تمیز اٹھا دی اور جوع الارض اور مادی فوائد اس کے لیے سب سے پُرکشش مقاصدِ حیات ٹھہرے۔ اسلامی تصوّرِ ایمان وعلم انسان میں خدا خوفی کا احساس راسخ کرتا ہے' جبکہ جدیدیت کا کج نظر اور بودا تصوّرِ علم اس کی آنکھ بے نم اور دل پتھر کا کر دیتا ہے۔

جماعت اسلامی سے وابستہ اصحابِ فکر ودانش بخوبی جانتے ہوں گے کہ جدید ٹیکنالوجی انسان اور انسانیت کو کس طرح تبدیل کر رہی ہے۔ جدید فکر انسان کو محض ایک جبلی اور نفسی خواہشات کو پورا کرنے والے ارتقائی ''ہیومن'' کی صورت میں پیش کرتی ہے جبکہ قرآنی ہدایت کے تناظر میں ہمارا بنیادی وصف یا essence 'انسان' ہونا نہیں بلکہ ''بندہ'' ہونا ہے' کیونکہ اسلامی وجودیات میں وجود دو ہی ہیں: ایک اللہ اور دوسرے ماسوا اللہ یعنی اوّل الذکر خالق' الٰہ یا معبود اور ثانیاً مخلوقات یا بالفاظِ دیگر اللہ کے تمام بندے۔ چنانچہ جمادات' نباتات چرند پرند اور انسان سب اللہ کے بندے اور مخلوق ہیں۔ انسانوں کے سوا تمام مخلوقات کی ''بندگی'' بالاجبار یا بالتسخیر ہے جبکہ انسان (مرد وعورت دونوں) کو تکوینی بندگی میں محدود اختیار بھی دیا گیا ہے جس کی بنیاد پر اسے تشریعاتِ الٰہی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ چاہے تو وہ انہیں قبول کر کے ان پر عمل کرے اور چاہے تو انکار کر کے کفر کا ارتکاب کرے۔ قصہ آدم و ابلیس اسی انسانی اختیار (Human free-will) کا بیان ہے۔ اس حوالے سے ہم مسلمانوں کی اصل اور بنیادی شناخت (essential identity) تسلیم ورضا کے ساتھ اللہ کے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُمتی ہونے کی ہے۔ دین اسلام اس اعتبار سے آئین بندگی کا نام ہے۔ اس کے لیے سہولت جہاں ایک جانب نوعِ بنی آدم میں روحِ ربانی کا پھونکا جانا اور دینِ فطرت پر ہر بچے/ بچی کی پیدائش ہے' تو دوسری جانب سلسلہ نبوت اور اس کی آخری کڑی ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے اُمورِ دینی کا پورا ضروری علم اور عملی نمونہ ہے جو محفوظ شکل میں سلف صالحین سے چلا آ رہا ہے۔

آئی ٹی اور جدید ٹیکنالوجی کی طرف دعوت دینے والے حضرات کے علم میں ہونا چاہیے

کہ اس وقت دنیا کے اکثر بڑے مفکرین اور صاحبانِ عقل و دانش کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عصری گلوبل مسائل مثلاً نیوکلیئر تباہی کا خطرہ' ماحولیاتی آلودگی اور موسمی تبدیلیاں' انسان کا احساسِ بیگانگی یا ذہنی مسائل اور اُلجھنیں وغیرہ کے پیچھے اصل ہاتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اور وہ اس کو زیر بحث لا کر problematize کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمن فلسفی کانٹ سے شروع ہونے والی تحریک تنویر (Enlightenment project) نے تقریباً تمام ادیانِ عالم میں پائی جانے والی انسانی مابعد الطبیعیاتی عظمت کو پاش پاش کر کے اسے نفس' خودی' قلب اور روح سے تہی دست (dehumanize) کر دیا۔ مغرب میں واقع ہونے والے صنعتی انقلاب کے سماجی و اخلاقی اثرات کو ہمارے وِژنری شاعر علّامہ محمد اقبالؒ نے تقریباً ایک صدی قبل اس شعر میں بیان کیا تھا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اسلامی سیکٹر کے اہل علم کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہونا چاہیے کہ جس طرح انسان کی روحانی مابعد الطبعی فطرت کو ڈارون' فرائیڈ یا ایلن ٹورنگ نے چیلنج کیا تھا وہ پرانا قصہ ہے اور بات اب بہت آگے نکل گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائبر سپیس اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور ان کے زیر اثر پروان چڑھنے والے سماجی علوم نے مل کر ایک بالکل نیا تصوّرِ انسان وضع کیا ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ وجود کو بھی ایک بالکل نئے انداز سے ڈیفائن کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایک اہم مغربی دانشور کے مطابق ٹیکنالوجی اب ہماری ontology ہی نہیں بلکہ ecology بھی بن گئی ہے' یعنی فرد اور پورا ماحول عالمگیریت کے سائے اور ڈیجیٹل دنیا کا عکاس اور پروردہ ہے۔ بائیوٹیکنالوجی اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس (AI) کے اشتراک سے انسان کی فطری تخلیق میں تبدیلی کر کے ایک طرح کا ٹرانس ہیومن وجود میں لانے کی سکیم تیار کی جا رہی ہے۔ اینڈرائڈ (سمارٹ موبائل فون) نے جس طرح ہمارے نوجوانوں کے ذہن اور لائف سٹائل کو تبدیل کیا ہے وہ سب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آج ہم بے حیائی اور فحاشی میں جکڑے جا چکے ہیں۔ ہمارا وقت فیملی' عبادت گاہ یا نیچرل بیوٹی کی سیر گاہوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے مختلف قسم کی سکرینوں کو دیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ ہم صورتوں (images))

کے سحر سے نکل کر کبھی کچھ لمحات خود احتسابی اور دروں بینی کے لیے نہیں نکال پاتے۔ جدید انسان کے لیے اب اصل علم وہ ہے جو وہ مغرب سے آئے ہوئے افکار میں دیکھتا ہے۔ بالعموم اس کے لیے جدیدیت اور لبرل ازم کے ڈسکورس میں کسی روحانی یا فطرت سے ماوراعنصر کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسان اب جبلی خواہشات اور سفلی جذبات کے تحت حرکت و عمل کرنے والا معاشی حیوان (Homo economicus) بن چکا ہے۔ سکرینز پر دیکھے جانے والا امیج کلچر شہوات کو بڑھاوا دینے کا مؤثر ذریعہ ہے اور نتیجتاً اِس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔

مندرجہ بالا منظر نامے کا تقابل اگر ہم اپنے دینی مسلمات اور معتقدات سے کریں تو ہمیں واضح تضاد اور ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ معروف تابعی حضرت حسن بصریؒ کے بقول دنیا سب کی سب اجاڑ ہے سوائے علماء کی مجالس کے، اگر یہ نہ ہوں تو لوگ بالکل چوپاؤں کی طرح ہو جائیں۔ بلاشبہ قرآن وسُنّت نے لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اقتصادی فلاح و انصاف اور سوشل جسٹس پر زور دیا ہے اور اس ضمن میں مرفہ الحال مسلمانوں کو کم وسائل اور کمزوروں کی مالی مدد کی بالصراحت تاکید کی ہے۔ فرض زکوٰۃ اور صدقات وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی مدّات سے غرباء ومساکین کی مدد کرنے پر صاحب ِ ثروت حضرات کے لیے عظیم اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے۔ چنانچہ شاہ نواز فاروقی صاحب نے پاکستان اور بالخصوص کراچی میں غربت وعسرت سے تنگ آئے لوگوں کے انتہائی منفی اقدام کو یقیناً بجا طور پر اُجاگر کیا ہے اور اس کا تدارک حکومتی سطح پر بھی اور اہلِ خیر حضرات کی جانب سے بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے خاندان میں سربراہ خانہ کی دو ملازمتوں کی تنخواہ سے بھی گزارا نہیں ہوتا تو خاتونِ خانہ اور بیٹی بھی شرعی حدود اور حجاب کا اہتمام کرتے ہوئے گھر میں یا باہر بھی جز وقتی جاب کر کے گھر کے اخراجات میں حصہ ڈال سکتی ہیں۔ لیکن جس طرح سوشل میڈیا پر موٹیویشنل سپیکرز کی طرف سے IT کے ذریعے کمائی اور مرفہ الحالی کا حصول اور دولت کی اندھی پرستش ایک باقاعدہ ٹرینڈ بن گیا ہے وہ انتہائی خطرناک اور غیر اسلامی ہے۔ ویسے بھی کارپوریٹ بزنس دفاتر میں نوجوان خواتین کا ملازمت کرنا ہمارے روایتی خاندانی نظام کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ لگتا ایسا ہے کہ ہم اس پورے مخلوط سسٹم کے تحت مغرب میں فیملی لائف اور خاندانی یونٹ کے ٹوٹنے سے سبق حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ المیہ

یہ ہے کہ مذہبی لیڈر شپ بھی اس حقیقت سے اغماض برتتے ہوئے طالبات کو آگے بڑھنے اور ’’قابلیت‘‘ بڑھا کر کمائی کرنے کی پُرکشش نفیر عام دے رہی ہے اور ہمارے دینی لٹریچر کی اہم اصطلاحات‘ قوتِ لایموت‘ قناعت اور رزق کفاف کو پس پشت ڈال کر حقوق النفس سے آگے بڑھ کر حظوظ النفس اور تنعم و تلذذ کی طرف دعوت دے کر آخرت میں ان کا حساب مشکل بنا رہی ہے۔ حدیثِ نبویؐ ہے: «اِنَّ البَذاذَۃَ مِنَ الایمان» (رواہ ابوداود و ابن ماجہ واحمد) یعنی سادگی‘ خستہ حالی اور کھردری زندگی بسر کرنا ایمان سے ہے یا اس کی نشانی ہے۔ ’قرون مشہود لھا بالخیر‘ میں ہماری یہی اعلیٰ قدریں تھیں جن کی طرف توجّہ بدقسمتی سے اب اہل دین کی بھی نہیں ہے۔ یہ نیرنگیٔ سیاستِ دوراں نہیں تو اور کیا ہے؟

گویا ہم بحیثیتِ معاشرہ دین اور دین داری میں اصلاح اور ترقی کی بجائے جس طرح دنیاداری اور مادّی سوچ کی طرف بگ ٹٹ بھاگ رہے ہیں اسے ہر فہیم ذہن اور دینی سوجھ بوجھ والا شخص دیکھ سکتا ہے۔ ایمان اور یقین قلبی میں افزائش جو تلاوت کلام پاک‘ اس کے معانی ومطالب کے مطالعے اور پنج وقتہ نماز کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے‘ وہ اب ہماری ترجیحات اور مصروفیات میں کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اسلامی سیکٹر بھی اب جس قسم کی اسٹریٹجی اپنا کر اپنے آپ کو عوام میں پاپولر اور معاشرے میں مؤثر بنانا چاہ رہا ہے‘ وہ سراسر مغربی لبرل تہذیب کی فاتحانہ پیش قدمی کا آئینہ دار ہے۔

راقم کی اس مختصر تحریر میں مغربی جدیدیت اور لبرل ازم کی اصطلاحات آئی ہیں جن کی تفصیلی اور فکر انگیز وضاحت کے لیے مَیں قارئین کی توجّہ قرآن اکیڈمی (انجمن خدام القرآن لاہور) کے استاذ اور انجمن کے رکن شوریٰ ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کی ویڈیوز کی طرف مبذول کراؤں گا۔ انہوں نے بیس ہفتوں میں فہم وتنقید جدیدیت پر تقریباً ۳۰ گھنٹے کے ہفتہ وار لیکچرز دیے۔ یہ پروگرام ۲۱ جولائی سے ۱۵ دسمبر ۲۰۲۲ء تک جاری رہا۔ غالباً یہ youtube پر موجود ہیں۔ انہی محاضرات کا خلاصہ عزیزم نے کراچی میں How Technology is changing us کے عنوان پر.... بیسیوں کتابوں کے حوالوں کے ساتھ.... لیکچر کی صورت میں دیا ہے۔ اُمید ہے قارئین خود بھی ان سے استفادہ کریں گے اور اپنے احباب سے بھی شیئر کر کے ان مفید اور علمی ایمانی افکار کو پھیلائیں گے۔

فہم دین　　حافظ ڈاکٹر محمد زبیر (۱)

علماء کون ہیں؟ 'عالم' کی تعریف کیا ہے؟
کون سے علماء انبیاء کے وارث ہیں؟

[حافظ ڈاکٹر زبیر صاحب کا لہجہ ذرا تیز اور کھردرا ہے لیکن ان کی بات بہرحال قابل غور ہے۔ مدیر]

سب سے پہلا سوال تو یہی ہے کہ علماء کون ہیں؟ یہ بات درست ہے کہ صحیح حدیث میں علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے لیکن یہ کن علماء کی بات ہو رہی ہے؟ درس نظامی پاس علماء کی؟ مدرسہ کے سرٹیفائیڈ علماء کی؟ منطق و بلاغت، اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی درسی کتابیں پڑھنے والے علماء کی؟ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ درس نظامی تھا، نہ مدارس کا نظام تھا، نہ وہ نصاب تعلیم تھا کہ جس سے گزر کر آج کسی کو عالم دین کا ٹائٹل دیا جاتا ہے؟ نہ صحابہ کرام اس نصاب تعلیم سے گزرے تھے کہ جس سے آج کے علماء گزرتے ہیں تو پھر وہاں 'علم' سے کیا مراد تھا کہ جن کے حاملین کو علماء کہا گیا ہے؟ صحابہ کے علماء کن علوم کے حامل تھے؟

آپ زمانہ نبوت میں جائیں۔ وہاں علم اپنی سادہ ترین صورت میں موجود تھا۔ تمام چالاکیوں اور مناظرانہ ابحاث سے پاک، الحمدللہ، اور یہی وہ علم تھا جو عمل کی بنیاد بھی بن رہا تھا۔ علم کوئی اسماء الرجال کے جاننے کا نام تھوڑی ہے کہ جسے بخاری و مسلم کے راویوں کے احوال یاد ہیں تو وہ بڑا عالم ہے۔ قرآن مجید جب علماء کا تعارف کرواتا ہے تو اس کی بنیاد عمل کو بناتا ہے اور وہ بھی اعمال القلوب۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہے کہ علماء ہی اللہ کی خشیت اختیار کرتے ہیں اور خشیت دل کا فعل ہے جو کسی خاص نصابِ تعلیم سے گزرنے یا کتابیں پڑھنے سے نہیں پیدا ہوتی۔ یہ معرفت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور معرفت الٰہی بھی وہ نہیں جو اسماء وصفات کی کلامی بحثوں میں الجھ کر پیدا ہو کہ یہ تو صحابہ اور سلف کے زمانے میں تھیں ہی نہیں۔ اور وہی سب سے بڑے عارف باللہ بھی تھے اور انبیاء کے ورثاء بھی۔

اس کو ایک اور طرح سے سمجھیں کہ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی ہے کہ عالم دین کے

---

(۱) فاضل درس نظامی، ایسوسی ایٹ پروفیسر علوم اسلامیہ، رفاہ یونیورسٹی، لاہور

ٹائیٹل کو ایک ڈگری کے ساتھ ٹیگ کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ عز وجل مومنوں کو جنت کی بشارت سناتے ہیں۔ کیا مومن ہونا کوئی ڈگری ہے؟ نصاب ہے؟ کورس ہے؟ جس سے گزرنے کے بعد کوئی مومن بن جاتا ہے اور جنت کا مستحق بھی۔ واضح بات ہے کہ مومن ہونا کچھ صفات رکھنے کا نام ہے۔ اگر وہ صفات آپ میں ہیں تو آپ مومن ہیں لیکن ان صفات کی موجودگی کے باوجود اپنے مومن ہونے کا آپ پھر بھی دعوی نہیں کریں گے۔ اگر کریں گے تو بے وقوف ہی کہلائیں گے۔ یہی معاملہ علماء کا بھی ہے۔ کتاب وسنت میں جنہیں علماء کہا گیا ہے، ان کی کچھ صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ عالم ہونا کسی ڈگری، کورس اور نصاب تعلیم سے گزرنے کا نام نہیں ہے جیسا کہ آج کل بدقسمتی سے سمجھ لیا گیا ہے۔ آج آپ اگر کسی کو مومن بننے کے لیے، آٹھ سالہ نصاب تعلیم سے گزار کر، اسے مومن ہونے کی ڈگری دے کر، مومن کا ٹائیٹل بھی دے دیں تو وہ کتاب وسنت کا مومن نہیں ہے، آپ کا مومن ہے۔ یہ فرق سمجھیے کہ آپ کے دماغ میں موجود مومنین کی فہرست پر تنقید، کتاب وسنت کے مومنین پر تنقید نہیں ہے۔

تو ہمیں چڑ علماء سے نہیں ہے لیکن وہ علماء ہیں کہاں جن کا ذکر کتاب وسنت میں ہے؟ اور جن علماء کا ذکر کتاب وسنت میں ہے، یہ وہ علماء ہیں کہ جن کے احوال قلوب یعنی دلوں کے حال کتاب وسنت کے مطالعہ نے بدل دیے ہوں۔ ایک جگہ قرآن مجید میں ہے کہ یہ قرآن تو اہل علم کے سینوں میں موجود آیات بینات ہیں۔ تو سینے میں آیت جب اس طرح روشن ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کی دلیل بن جائے اور اس کے نتیجے میں خشیت پیدا ہو تو یہ عالم دین ہے۔

سلف کے زمانہ میں علماء کسے کہتے تھے؟ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی زبانی سنیں۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ علماء وفقہاء آپ کے فتووں کا مذاق اڑاتے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا کہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ عالم وفقیہ کسے کہتے ہیں؟ عالم وفقیہ وہ ہے جو اپنے سے چھوٹے والے کا مذاق نہ اڑائے اور اپنے سے بڑوں پر اشارے کنایوں سے بات نہ کرے۔ اور اپنے علم سے لوگوں کو رگیدنے کا کام نہ کرے۔ یہ قول اخلاق العلماء میں موجود ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ فی زمانہ عالم وہ ہے جو کسی دوسرے عالم کی بدخوئی، غیبت اور چغلی نہ کھائے کہ فی زمانہ یہ سماجی برائیاں سرٹیفائیڈ علماء میں عوام سے بھی زیادہ ہیں۔

اب لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں تو کیا پھر آپ خود ایسے عالم ہیں؟ میں نے تو کبھی اس

معنی میں عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور حافظ لکھتا ہوں۔ عالم ہونا میرے نزدیک کوئی ڈگری نہیں ہے بلکہ احوال اور کیفیات کا نام ہے جو کتاب وسنت کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہیں اور فی زمانہ جنہیں علماء کہتے ہیں، ان میں وہ احوال اور کیفیات اکثر مفقود ہیں۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ مدارس میں جس نصاب تعلیم سے اور جس انداز میں گزارا جاتا ہے، اس سے وہ کتاب وسنت والے علماء یعنی علمائے ربانی بالعموم پیدا نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی پیدا ہو رہا ہے اور یقینا ہو رہا ہے تو اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر ہو رہا ہے، سسٹم اسے پیدا نہیں کر رہا کیونکہ پورے تعلیمی نظام یا سسٹم کی بنیاد اور اٹھان ہی کچھ اور ہے۔ باقی علماء سے مراد اگر سرٹیفائیڈ اور ڈگری ہولڈر ہیں یا خاص نصاب تعلیم پاس کیے ہوئے ہیں تو ہمارے پاس بھی ڈگریاں ہیں اور ہم بھی وہ نصاب تعلیم نہ صرف پڑھ چکے ہیں بلکہ پچھلے بیس سال سے پڑھا رہے ہیں لہذا علماء ہیں۔

اب اسی سوال کو لے لیں کہ علماء کو تبلیغ کی اجازت ہونی چاہیے، عامی کو نہیں۔ اور علماء سے مراد ڈگری ہولڈر ہے۔ تو حدیث میں جس عالم کو نبی کا وارث کہا گیا ہے، یعنی صحابہ کو، ان کے پاس کون سی درس نظامی کی ڈگری تھی؟ صحابہ کے پاس محض کتاب وسنت کا علم تھا اور وہ دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صحبت نبوی ﷺ سے ان کی تربیت ہو چکی تھی۔ تو آج بھی تربیت ڈگری ہولڈر علماء اور سرٹیفائیڈ مولوی نہیں کریں گے بلکہ کتاب وسنت کے علمائے ربانی کریں گے کہ جن کے احوال وکیفیات، معرفت الٰہی کے سبب بدل چکی ہیں۔ اور ان کی محض صحبت سے دلوں کے احوال اور کیفیات بدل جاتی ہیں۔ یہ وہی ہوں گے جو افعال القلوب میں اچھے ہوں گے کہ علم نافع یا علم حقیقی کا ثمرہ اور نتیجہ یہی ہے۔ ان کے دل ریا کاری، تکبر، حسد، بغض، نفرت، عداوت، نفاق، عُجب، خود پسندی وغیرہ سے پاک ہوں گے اور خشیتِ الٰہی، تواضع، عجز، محبت، ایثار، احسان، حیاء، شجاعت اور زہد وغیرہ سے معمور ہوں گے۔

تو جس طرح مسلمانوں پر نقد اسلام پر نقد نہیں ہے۔ اسی طرح معاصر علماء کے رویوں اور اخلاق پر نقد، کتاب وسنت میں جن علماء کا تذکرہ ہے، ان پر نقد نہیں ہے۔ معاصر علماء یہ کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو کتاب وسنت کی نصوص کا مصداق بنا لیتے ہیں۔ بھئی، کتاب وسنت

میں علماء کا ذکر ہے، ٹھیک ہے، ہے۔لیکن اس میں آپ، آپ کے استاذ، آپ کے شیخ اور پیر، اور آپ کے فرقے اور مسلک کے سارے سرٹیفائیڈ مولوی بھی شامل ہیں تو یہ کہاں لکھا ہوا ہے؟ اب ہر فرقے کے علماء دوسرے فرقے کے علماء کو گمراہ بھی سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو انبیاء کا وارث بھی۔ گو یا ہر فرقے کے علماء کے نزدیک دوسرے فرقے کے علماء کتاب وسنت کی نصوص کا مصداق نہیں ہیں۔اگر ہیں تو مجھے بتائیں؟ کیا اہل حدیث علماء کے نزدیک، علماء انبیاء کے وراث ہیں، اس سے مراد بریلوی اور دیوبندی علماء بھی ہیں؟ اور کیا بریلوی اور دیوبندی علماء کے نزدیک اس سے مراد اہل حدیث علماء بھی ہیں؟ تو ہم کوئی نیا کام نہیں کر رہے ہیں۔ وہی کام کر رہے ہیں جو پہلے ہی علماء کر رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو کتاب وسنت میں مذکور علماء نہیں مان رہے۔ اور یہ سب فرقوں کے علماء ایک دوسرے کے بارے میں ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہم بس اتنا کہہ رہے ہیں۔

قرآن مجید جب تبلیغ کی بات کرتا ہے تو تین مدارج کا ذکر کرتا ہے یعنی حکمت، اچھی وعظ ونصیحت اور مجادلہ احسن یعنی اچھے طریقے سے بحث مباحثہ کر لینا۔ اب علماء جس نظام تعلیم سے گزرتے ہیں، وہاں انہیں کون سی حکمت اور موعظہ حسنہ کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہاں، تحریکوں اور تبلیغی جماعتوں کی دعوت وتبلیغ میں آپ کو حکمت اور موعظہ حسنہ دیکھنے کو مل جاتی ہے کہ انہوں نے اس کو اپنے لیے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ علماء نے تو تبلیغ کے نام پر صرف ایک کام کیا ہے یعنی مجادلہ۔ اور وہ بھی احسن نہیں، بلکہ اکثر تو اقبح ہی کیا ہے۔

حضور! علم وعمل میں زمین وآسمان کا گیپ پیدا ہو چکا۔ علماء اب عمل وکردار کے غازی نہیں رہے۔ محض علم کے دعووں سے کب تک عوام کو بے وقوف بناتے رہیں گے۔ علم وہی ہے جو علمِ نافع ہے یعنی جو عمل کی بنیاد بن رہا ہے۔ باقی تو کچھ اور ہی ہے، علم نہیں ہے۔ پہلے زمانے میں علم کے ثمرات خشیتِ الٰہی اور زہد وورع ہوتا تھا اور آج کل کروڑوں کا مدرسہ، لاکھوں کی جماعت، کئی ایک پراڈوز اور آگے پیچھے گارڈز ہوتے ہیں۔ اور اب اس میں سوشل میڈیا کے فالوورز بھی شامل کر لیں۔ یہ سب دنیا ہے جو علماء سمیٹ رہے ہیں اور ساتھ میں دعوی ہے کہ ہمیں انبیاء کا وارث بھی مانا جائے کہ جن کی کوئی میراث ہی نہیں ہوتی تھی۔ جو چھوڑتے تھے، وہ صدقہ شمار ہوتا تھا۔ اور یہاں بیٹے یا خاندان سے باہر کچھ جاتا ہی نہیں ہے، نہ مدرسہ نہ

جماعت۔ٹھیک ہے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ، گارڈز والے، مدرسوں کے مالک، علماء اگرچہ چند ایک ہی ہوتے ہیں لیکن ایک بڑی تعداد ان کے موالیوں کی ہوتی ہے کہ جن کی زندگی کا مقصد ان کے دفاع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

تو عرض یہ ہے کہ اس علماء کلچر سے جان چھڑائیں۔ یہ اب علماء پرستی شروع ہو چکی ہے۔ اب بہت ہو چکا۔ لوگوں کو اسی طرح کتاب وسنت سے جوڑیں جیسا کہ صحابہ جڑے ہوئے تھے۔ اور وہی دعویٰ کریں جو نبیوں کو سکھایا گیا ہے کہ اس سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور ساتھ میں یہ بھی کہے کہ میں [عام] مسلمانوں میں سے ہوں۔ کچھ خاص دکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی عام مسلمان ہی ہیں۔ پہلے ہی اس قوم کا بہت استحصال ہو چکا۔ اب مزید کی گنجائش نہیں ہے۔

بقیہ: فرسودہ نظامِ تعلیم کی تباہ کاریاں

اصلاح حال کے لیے تجاویز

* پرائمری اور ایلیمنٹری کلاسز سے ہم نصابی سرگرمیوں کی طرز پر ایسی ہم نصابی کتب کا اضافہ کیا جائے جن سے طلبہ وطالبات کو دین کی ماہیت اور اصلیت کو سمجھنے اور اس کے جوہر لطیف پر عمل کر کے اپنی صلاحیت اور استعداد کو بڑھانے کا موقع مل سکے۔

* مخلوط نظام تعلیم کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ یونیورسٹی، میڈیکل یونیورسٹی اور کالجز خواتین اور مردوں کے الگ الگ ادارے بنا دیے جائیں جن کا سٹاف اور بالائی افراد بھی مخلوط نہ ہوں۔

* جامعات کے نظام امتحانات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا جائے۔ HEC الگ سے امتحانات کا نظام وضع کرے جو اس کے اپنے کنٹرول میں ہو اور تھیوریٹیکل سوالات وجوابات کی طرز پر پرچے بنائے جائیں۔ جامعات، ڈیپارٹمنٹ اور فرد واحد کے اختیار سے امتحانی نظام کو واپس لے لیا جائے۔ اس طرح کوالٹی آف ایجوکیشن بہتر ہوگی اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور جیسے واقعات کی بھی روک تھام ہوگی۔

فہم دین　　　　　　　　　　　　　　　　　سید خالد جامعی

قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری (آخری قسط)

قومی ریاستیں مذہبی رہنماؤں کو استعمال تو کرتیں ہیں، ان کی مانتی نہیں

یوم بدر: رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قوم کی نہیں دین کی سلامتی کی دعا کی

رسالت مآب نے میدان بدر میں رات کو جو دعا مانگی تھی اس میں بھی دین کے لیے یعنی دین کی سلامتی کی دعا، امت کے تحفظ کی دعا مانگی تھی، مٹھی بھر مسلمانوں کی حفاظت کی آرزو ظاہر کی تھی، ریاست کی حفاظت کی دعا نہیں کی تھی۔

رسالت مآب کے الفاظ تھے "اَللّٰھُمَّ ان تھلك هذه العصابة اليوم لا تعبد۔ اللّٰھم ان شئت لم تعبد بعد اليوم ابدًا۔

اے اللہ اگر آج یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی۔ اے اللہ اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے۔ جواب میں وحی نازل ہوئی: ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴾ [الانفال ۸: ۱۲]، ﴿اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ﴾ [الانفال ۸: ۹] اور اللہ کے رسول کفار کی تباہی وبربادی کے بارے میں فرمارہے تھے کہ ﴿سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ [القمر ۵۴: ۴۵]

میثاق مدینہ وحدت ادیان اور قوم پرستی کا قومی معاہدہ نہیں تھا

میثاق کے تحت یہود مسلم برابر نہیں تھے حاکمیت صرف رسول اللہ کی تھی۔

میثاق مدینہ میں امت یہود اور امت محمدیہ کو ایک جیسا درجہ نہیں دیا گیا یہاں مساوات نہیں ہے اسلام اور یہودیت برابر نہیں ہیں م۔ یثاق میں طے ہوگیا کہ مدینہ میں حکم صرف اور صرف اللہ کے رسول کا چلے گا۔

اللہ اوراس کے رسول کا حکم میثاق مدینہ کے تحت برتر حکم [Supreme Law] ہے۔ حکومت وفرماں روائی صرف رسول اللہ کی تسلیم کی گئی تھی۔ ہر اختلافی معاملے میں فیصلہ رسالت مآب کا ہوگا۔ "وانکم منهما اختلفتم فيه من شى فان مرده الي الله عزوجل والي محمد۔" میثاق کی تفصیلات کے لیے سیرت ابن ہشام، ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، البدایہ والنہایہ، کتاب الاموال سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اس معاہدے کی کل ۵۲ دفعات تھیں۔ سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل، تاریخ طبری، لسان العرب اور طبقات ابن سعد میں میثاق کے بعض اقتباسات کے حوالے موجود ہیں۔

معاہدے میں حقوق وفرائض کے اعتبار سے یہود ومسلمان برابر نہیں۔ ورنہ یہود بھی مرجع اطاعت ہوتے۔ ان کو بھی کبھی حاکمیت عطا کی جاتی وہ بھی کبھی اقتدار کے اہل ہوتے میثاق میں توصرف یہود کو اپنے دین پر عمل کی آزادی دی گئی۔ اقتدار، اختیار، حاکمیت، میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا یہ طے شدہ معاملہ تھا۔

لليهود دينهم وللمسلمين دينهم

معاہدے میں یہود نے قریش کو اپنا دشمن تسلیم کیا حالانکہ قریش سے یہودیوں کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ انہوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کو اپنا دشمن تسلیم کیا۔ معاہدے میں واضح کر دیا گیا کہ دین کے معاملے میں کسی جنگ کا معاملہ ہو تو نہ یہود صلح کی بات کریں گے اور نہ مسلمان اس معاملے میں یہود کی صلح قبول کریں گے۔ معاملات دین میں کسی قسم کی مصلحت، مداہنت قابل قبول نہیں ہوگی۔

واذا دعوا الي صلح يصالحونه ويلبسونه فانهم يصالحونه ويلبسونه وانهم اذادعوا الي مثل ذلك فانه لهم علي المومنين الا من حارب فى الدين۔

امت کے اس عظیم تصور کے باوجود پاکستانی مذہبی قوم پرستی صرف ایک نعرے پر متحرک ہوجاتی ہے کہ اس وقت پاکستان کو بھارت اسرائیل امریکہ سے خطرہ ہے، خواہ خطرہ ہو یا نہ ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ غیر مختون دہشت گرد ملے ہیں لہٰذا کسی بھی غیر ختنہ شدہ دہشت گرد کی جھوٹی سچی اطلاع علماء کو متحرک کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ مغرب نے قوم پرستی کا فتنہ ایجاد کیا اور ہم

سب قوم پرستی کے فتنے میں مبتلا ہیں۔ اس قوم پرستی نے اسلامی علمیت، عصبیت، حمیت کو برباد کردیا ہے۔ فاٹا میں قوم پرستی کا تازہ فتنہ اسلامی قوتوں کے لیے نئی دعوت مقابلہ ہے۔ ماضی میں مصلحت ومصالحت، غض بصر، لاتعلقی کے بعداب نیا فتنہ سامنے ہے۔ علماء اس سے لاتعلق ہیں۔ یہ فتنہ رہی سہی اسلامی حمیت وعصبیت کو ختم کردے گا۔ علماء کو اس کا اندازہ نہیں ہے وہ صرف انتخابی سیاست، انتخابی اتحادوں میں مصروف ہیں لیکن صرف انتخابی سیاست کو محور ومرکز بنانا انقلاب کے لیے خطرناک رویہ ہے۔

محمود شاہ کو مولانا فضل الرحمان کا انٹرویو جو جنگ میں ۵/اپریل ۲۰۱۸ء کو شائع ہوا جس میں مولانا نے بتایا کہ صدر مشرف نے ایوان صدر بلایا اور کہا آپ وزیراعظم کے لیے الیکشن نہ لڑیں آپ الگ ہوجائیں۔ ISI کے جنرل احسان الحق نے افطار کا اہتمام کیا اور مولانا کو مشورہ دیا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے عہدے سے دست بردار ہوجائیں۔ چوہدری شجاعت کو تین امریکی سینٹروں نے کہا کہ ہم آپ کی حکومت نہیں بننے دیں گے۔ امریکی وزیر نے کہا کہ مشرف آپ کی حکومت نہیں چاہتے ہم کیا کرسکتے ہیں۔ سہیل وڑائچ، ریمنڈ ڈیوس اور چوہدری شجاعت حسین کی کتابوں کو پڑھنے کے باوجود اگر علماء موجودہ سیاسی عمل میں شراکت سے کوئی بہتری دیکھتے ہیں تو یہ حیرت انگیز بات ہوگی۔ انہیں از سرنو اپنے نئے کردار اور حکمت علی پر غور کرنا چاہیے ورنہ پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔

حقیقت حال کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

۱۔ چوہدری شجاعت حسین، ''سچ تو یہ ہے''

۲۔ سہیل وڑائچ، ''مذہبی سیاست''

۳۔ ریمنڈ ڈیوس، *The Contractor: How I Landed in a Pakistani Prison and Ignited a Diplomatic Crisis*

۴۔ کے عارف، *Pak America Relations, 2 Volumes*

۵۔ فرید زکریا، *The Future of Freedom*

۶۔ ایمی چوا، *The World on Fire*

بلی گراہم امریکہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکا، ہم بھی یہاں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکیں گے۔تبدیلی کے لیے ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔جمہوریت اور عسکریت دونوں کا نتیجہ علماء کے سامنے آچکا ہے۔جدوجہد کے ایک ہزار طریقے ہیں۔انبیاء کی تاریخ دیکھیے اصحاب کہف، اصحاب خندق، فاطمیینِ مصر کے اقتدار میں علماء کی جدوجہد، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، مجدد الف ثانیؒ۔کیا یہ راستے متروک ہوچکے ہیں؟ یہ موجود ہیں مگر اس میں جان کے زیاں کا اندیشہ ہے۔

ہم وہ جدوجہد چاہتے ہیں جس میں دوسروں کو تو نقصان پہنچے مگر ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔انبیاء کی جدوجہد اپنے نقصان سے شروع ہوتی ہے۔وہ ایثار و قربانی مشقت و جدوجہد کی تاریخ دہراتے ہیں لیکن اپنی امت سے صرف ایک ہی بات کرتے ہیں کہ ہم تم سے کسی اجر کے طالب نہیں۔ ﴿وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝145﴾ [الشعراء۲۶: ۱۴۵] قرآن بتاتا ہے کہ لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں جو لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے ﴿اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡـَٔلُكُمۡ اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۝21﴾ [یس۳۶: ۱۹] دنیا کی ہر شے سے بے پروا۔

عہد حاضر میں عموماً لوگ جمہوریت یا عسکریت پسندی کے سوا جدوجہد کا کوئی تیسرا تصور بھی نہیں رکھتے۔قرآن جدوجہد کے بے شمار طریقے بتاتا ہے۔انبیاء کی جدوجہد نہ جمہوری ہوتی ہے نہ عسکری وہ مختلف مراحل سے گزر کر کفار سے جہاد کرتے ہیں۔عصر حاضر میں وہ لوگ جو جہاد، عسکریت پسندی، احتجاجی جدوجہد، انتقامی کاروائی، دفاعی جدوجہد اور ردّ عمل کی جدوجہد میں فرق تک نہیں کرسکتے وہ ہماری رہنمائی کے دعوے دار بھی ہیں۔

بلی گراہم بھی سفید فام اور امریکی عیسائی قوم پرستی کے مرض میں مبتلا تھا

David Hollinger ایک اہم کتاب کے منصف ہیں کتاب کا نام ہے:

"Protestants Abroad: How Missionaries Tried to Change the World but Changed America."

ہولنگر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں پروفیسر ایمریطس ہیں۔انہوں نے بلی گراہم پر

نیو یارک ٹائمز میں ایک اہم مضمون میں انکشاف کیا ہے کہ بلی گراہم جیسے روحانی مذہبی غیر متنازعہ عیسائی عالم بھی قوم پرستی کے مرض میں کتنے گرفتار تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر ہم کئی عشروں تک امریکہ میں ایک معتبر عالم اور روحانی شخصیت کے طور پر زندہ رہے ان کی عمر سو سال تھی لیکن وہ امریکہ میں سفید فام نسل پرستوں کے ہاتھوں سیاہ فام نسل کی توہین و تذلیل کو ایک ذاتی مسئلہ سمجھتے تھے اور Civil Rights Movement کے حامی نہیں تھے۔ وہ اسے ایک قومی نسل مسئلہ Civil Evil نہیں فرد کا ذاتی معاملہ [Personal Problem] سمجھتے تھے۔

مذہبی قوم پرستی امریکہ، ترکی، ایران، پاکستان کا نہیں ہر جگہ کا مسئلہ ہے۔ مذہب کی قوم پرستانہ تشریحات ہر ملک کا مسئلہ ہے۔ مسلم قوم پرستی مسلم امت کے تصور کو دھندلا رہی ہے اور مغرب میں عیسائی قوم پرستی عیسائی مذہب کی آفاقیت کو دھندلا رہی ہے۔

گراہم نے اپنے بیٹے فرینکلن گراہم کو اپنا مذہبی جانشین بنایا۔ بش نے عراق پر حملہ کیا تو بلی گراہم نے قوم پرستی کے جذبے کے تحت امریکہ کی مسلط کردہ عراق جنگ کی حمایت کی اور امید ظاہر کی کہ اس جنگ کے نتیجے میں عراق کو عیسائی ریاست بنانے میں کامیابی حاصل ہوگی بے چارے بلی گراہم کو اکیسویں صدی میں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ امریکہ حقوق انسانی کا علمبردار ہے اور حقوق انسانی کے منشور کے تحت کسی شخص کا مذہب تبدیل نہیں کیا جاسکتا نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ جدید قومی ریاست کے ذریعے ہر شخص کا مذہب آزادی، مساوات، ترقی ہو چکا ہے۔

جب جدید ریاست لوگوں کے مذہب کو خود تبدیل کر رہی ہے، ان کو مذہب سے ماورا کر کے آزادی دے کر ترقی دلا رہی ہے تو مذہب بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب دنیا نے اس تین نکاتی مذہب آزادی، مساوات اور ترقی کو مشترکہ طور پر بخوشی قبول کرلیا ہے تو مذہب کی تبدیلی کی کیا ضرورت ہے؟ جو آدمی آزادی، مساوات، ترقی کے عقیدوں کو مان لیتا ہے وہ کسی مذہب کا نہیں رہتا وہ بس معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کے مذہب کو قبول کر لیتا ہے اور اپنی زندگی ایک 1.Consumer, 2.Spectator, 3.Worker, 4.Voter: کی چار حیثیتوں میں تقسیم کر کے اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ گراہم کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جدید انسان اور جدید ریاست کے صرف تین اہداف ہیں: ۱۔ لامحدود علم ۲۔ لامحدود طاقت

۳۔ لامحدود سرمایہ، لہٰذا سب نفس مطمئنہ سے محروم ہیں اور ترقی کے لیے مر رہے ہیں۔ بے چارے گرا ہم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ منشور انسانی حقوق کے تحت کوئی مذہبی جنگ لڑی ہی نہیں جاسکتی۔ Crusade ممکن ہی نہیں اب تو صرف آزادی کے مذہب کے لیے جنگ، جہاد، Crusade ہوسکتا ہے کیونکہ یہی مشترک مذہب ہے۔ تمام قوموں نے منشور انسانی حقوق پر دستخط کیے ہیں۔

اس منشور کے تحت ہر ریاست بیرونی جارحیت کے خلاف صرف اپنا دفاع کرسکتی ہے کسی کے خلاف اقدامی جنگ نہیں کرسکتی کیونکہ تمام قوموں کا ایک ہی مذہب ہے آزادی، مساوات اور ترقی لہٰذا مذہبی، مسلکی، نظریاتی اختلافات ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے امریکہ، روس، چین ایک دوسرے کو قرضے دے رہے ہیں۔ بھارت پاکستان ایک دوسرے سے تجارت کرر ہے ہیں ایک دوسرے کی فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ روم، ایران، یونان، چین، ہند، اسلام کی سلطنتوں نے کبھی ایک دوسرے کو قرضے نہیں دیے، کبھی ایک دوسرے کو مضبوط بنانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کے عقیدے مختلف تھے۔ عقیدے جب ایک ہوتے ہیں تو قرضے چلتے ہیں اور معاشی خوشی حالی کے لیے عالمی تعاون کے دعوے ہوتے ہیں۔ ہر سطح پر تعاون ہوتا ہے کیونکہ سب کا ایک ہی مقصد ہے صرف اور صرف ترقی۔

پاکستانی آئین کے آرٹیکل 245 میں قتال، جہاد کا ذکر نہیں صرف دفاع کا ذکر ہے

’’پیغامِ پاکستان‘‘ کے تحت ریاست کو جہاد کا حق دیا گیا ہے مگر آئین کے تحت جہاد تو نہیں ہوسکتا۔ عصر حاضر کا عالمی مذہب ترقی ہے جو آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

دنیا کے تمام آئین دساتیر مذہب انسانی حقوق [Human Rights] کے تحت بنائے جاتے ہیں لہٰذا دنیا کے کسی آئین میں جہاد کی اجازت نہیں ہے۔ جدید ریاست صرف اپنی سرحدوں کا دفاع کرسکتی ہے لہٰذا کسی آئین میں جہاد کا لفظ موجود ہی نہیں یہ بات ہمارے باجوہ صاحب کو بھی معلوم نہیں لہٰذا وہ میونخ میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جہاد بالنفس اعلیٰ ترین جہاد ہے اور کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا اس کی ایک شکل ہے۔ عسکری جہاد ایک ارتقاء پذیر تصور ہے جو رفتہ رفتہ ایک صورت اختیار کر گیا ہے، یہ قتال ہے اور اس کی اجازت

صرف ریاست کے پاس ہے۔ باجوہ صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پاکستانی آئین کی دفعہ 245 میں نہ جہاد کا لفظ ہے نہ قتال کی اصطلاح۔ آئین میں نہ جہادا کبر کا ذکر ہے نہ جہاد اصغر کا جدید ریاست نہ جہادا کبر کرسکتی ہے نہ جہاد اصغر۔ جہادِ اکبر نفس کے خلاف جدید ریاست کا مسئلہ ہی نہیں کیونکہ جدیدیت میں نفس Self آزاد فاعل مختار مطلق ہے جو چاہے کرگزرے۔ ریاست فرد کی آزادی میں مداخلت نہیں کرسکتی، اسے نیک بننے پر مجبور نہیں کرسکتی لہٰذا پاکستان کے تعلیمی نظام میں، ریاستی نظام میں، میڈیا میں فرد کی تربیت، اصلاح، تزکیہ نفس، تطہیر قلب، تعمیر کردار کا کوئی ادارہ۔ نصاب موجود نہیں ہے۔ کیونکہ شریف بننا نہ بننا فرد کا مسئلہ ہے شرافت ایک Subjective چیز ہے ریاست اس چکر میں نہیں پڑتی۔ لہٰذا آئین پاکستان میں جہاد اکبر، تزکیۂ نفس کا بھی کوئی ذکر نہیں جدید ریاست مذہبی اصطلاحات نہ تسلیم کرتی ہے۔ نہ قبول کرتی ہےاور نہ اختیار کرتی ہے۔ وہاں صرف اور صرف دفاع کی اصطلاح ہے وہ بھی کسی بیرونی جارحیت کے خلاف

Article 245: Defend Pakistan against external agrresion and threat of war subject to Law, act in and of civil power when called upon to do so.

پاکستانی آئین کے بارے میں نہ باجوہ صاحب کو معلوم ہے نہ آٹھارہ سوسادہ لوح علماء کو پتا کہ پاکستانی ریاست بھی جہاد نہیں کرسکتی۔ جدید قومی ریاست جب مذہب انسانی حقوق کو مانتی ہے تو وہ جہاد کیسے کرے گی؟ وہ صرف دفاع کرسکتی ہے اسے بس اس کام کی اجازت ہے لہٰذا جہاد نہ ریاست کا فرض ہے نہ مسلمانوں کا، نہ مذہبی تنظیموں کا۔ UNO نے منشور انسانی حقوق کے تسلط کے بعد جہاد کا باب ہی ختم کردیا ہے اور ہمارے باجوہ صاحب اور سادہ لوح علماء کو آئین پاکستان اور منشور انسانی حقوق کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ 'پیغام پاکستان' میں وہ ریاست کو جہاد کا حق دے رہے ہیں یہ حق تو آئین نے نہیں دیا عملاء ماورائے آئین حق ریاست کو کیسے دے سکتے ہیں وہ تو آئین کے پابند ہیں۔ آئین کے خلاف کیسے بات کرسکتے ہیں؟ انہوں نے تو کبھی آئین میں شریعت کورٹ کی حقیقت تک نہیں پڑھی ایسی کمزور بے زور عدالت سے وہ ابھی تک نفاذ شریعت کی امید باندھتے ہیں جس عدالت کا چیف

جسٹس وہ بھی بن سکتا ہے جسے عربی نہیں آتی۔ آصف زرداری کے ایک دوست کو چیف جسٹس بنایا گیا تاکہ چیف جسٹس کی مراعات حاصل ہوسکیں جو نہ شریعت جانتے تھے نہ عربی۔ شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کی شرائط ملازمت صدر جب چاہے تبدیل کرسکتا ہے اسے OSD بنا سکتا ہے آئین میں ایک ترمیم سے یہ اختیار ختم کیا گیا۔ شریعت کورٹ کے جج کی مدت تعیناتی صرف تین سال ہے جبکہ تمام عدالتوں کے جج ریٹائرمنٹ تک کام کرتے ہیں۔ علماء کبھی آئین پاکستان بھی پڑھ لیں۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں شریعت کورٹ کے چیف جسٹس سوڈان کے دورے پر تھے انہیں OSD بننے کا حکم ملا۔ وہ چیف جسٹس سے OSD ہوگئے۔ کسی جج کو سزا دینا ہو، ہائی کورٹ سے نکالنا ہو تو اسے شریعت کورٹ بھیج دیا جاتا ہے۔ جنرل مشرف کے زمانے میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس افضل سومرو کے خلاف بے پناہ شکایات ملیں تو سزا کے طور پر شریعت کورٹ بھیج دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے زمانے میں جسٹس شفیع محمدی کو ہائی کورٹ سے شریعت کورٹ بھیج دیا گیا۔ شریعت کورٹ اپیلیٹ بنچ میں سپریم کورٹ کے وہ جج شامل ہوتے ہیں جو نہ عربی جانتے ہیں نہ اسلام لیکن سپریم کورٹ کی کسی بنچ میں کسی عالم دین کو شامل نہیں کیا جاتا۔ سیکولر عدالت کو شریعت کے عالم کی ضرورت نہیں ہے البتہ شریعت عدالت سیکولر ججوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہ ہے ہماری شریعت کورٹ جس سے بڑی امیدیں ظاہر کی جارہی ہیں۔

میونخ کی تقریر میں باجوہ صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ درست نہیں۔ منشور انسانی حقوق کے تحت تو کوئی مذہبی فریضہ ریاست ادا ہی نہیں کرسکتی لہٰذا جدید ریاست جہاد بھی نہیں کرسکتی وہ صرف بیرونی حملے سے اپنی ریاست کو بچا سکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ آزادی کے عقیدے کے تحفظ کے لیے NATO سیٹو، سینٹو، بغداد پیکٹ جیسے معاہدوں کے ذریعے امریکی اور مغربی مفادات یعنی آزادی، مساوات اور ترقی کی خاطر عالمی اداروں کی چھتری کے تحت UNO کی اجازت سے کرایے کے سپاہی کے طور پر، یا رضا کارانہ جنگ کرنے جاسکتی ہے۔

عدالت کسی مذہب روایت اجتماعیت کا نہیں صرف فرد کے حق کا تحفظ کرسکتی ہے

یہاں لڑکی گھر سے بھاگتی ہے تو سپریم کورٹ اسے آزادی کا عمل کہتی ہے، لڑکی کو کچھ نہیں کہتی۔

منشور انسانی حقوق فیڈرلسٹ پیپرز (Fedralist Papers) کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں۔ اس کی تیاری میں امریکی صدر کی اہلیہ ایلینیا روز ویلٹ نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ منشور انسانی حقوق کی کسی شق میں ریاست کے مذہبی ہونے کی کوئی شق نہیں۔ منشور میں صرف فرد کی مذہبی آزادی کی ضمانت صرف اور صرف فرد کے ذاتی دائرۂ نجی زندگی (Personal Sphere) میں دی گئی ہے۔ فرد اپنے بیوی بچوں کی مذہبی آزادی میں بھی مداخلت نہیں کر سکتا۔

منشور انسانی حقوق کی تیس شقوں میں کسی جگہ اللہ، آخرت، عذاب، ثواب، ہدایت، نیکی کا کوئی لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔ اس منشور میں صرف زندہ انسانوں کو حقوق دیے گئے ہیں مرے ہوؤں کا کوئی حق نہیں حتیٰ کہ رحم مادر میں موجود بچے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ماں اگر چاہے تو اس بچے کو دنیا میں آنے سے روک دے، اسے قتل کر دے، اسقاط کرا دے۔ اس منشور میں اللہ کی اربوں مخلوقات کے لیے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ اسی لیے بھارت کی الہ آباد ہائی کورٹ نے دریائے گنگا کے حقوق کے تحفظ کے لیے دریا کو Human قرار دیا اور اس کے حقوق کے تحفظ کا اعلان کیا ہے۔

منشور انسانی حقوق میں صرف فرد کے حقوق کی ضمانت ہے، اجتماعیت کے حقوق کی نہیں

منشور میں صرف اور صرف فرد کی آزادی کی حفاظت دی گئی ہے کسی مذہبی اجتماعیت کے حقوق کی ضمانت نہیں دی گئی۔ کوئی بھی فرد اپنی مذہبی اجتماعیت کے خلاف کھڑا ہوگا تو ریاست فرد کے حق کی حفاظت کرے گی فرد کی مخالف، مذہبی، تاریخی، لسانی، ثقافتی اجتماعیت کے حقوق کو کچل دے گی۔ اسی لیے پاکستان کی سپریم کورٹ بھی گھر سے ماں باپ کی عزت، مال و دولت، سامان، خاندان کے وقار کو لوٹ کر لے جانے والی بھگوڑی لڑکی کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بناتی اس کو نہیں پکڑتی، نہ اس سے یا اس کے آشنا سے کبھی پوچھتی ہے کہ تم نے اسلام، عفت، حیاء، شرم کی اقدار کو پامال کیا۔ اور اپنے ماں باپ، خاندان کی عزت کا خاتمہ کیا کیونکہ ہیومن رائٹس صرف فرد کے ہیں۔ ان میں عزت، حرمت، عفت، عصمت، خاندان، مذہب، اقدار، روایات کا کوئی تحفظ نہیں نہ ان کا ذکر ہے۔ ہر فرد آزاد ہے جو چاہے کر گزرے۔ ہیومن رائٹس کسی اخلاقیات، اقدار کے قائل نہیں۔ یہ سب آزادی کی راہ میں رکاوٹیں ہیں لہٰذا سپریم کورٹ

صرف لڑکی اور اس لڑکی کے عاشق آشنا بھگوڑے کے بھاگنے کے حق کا مکمل تحفظ کرتی ہے۔ اس لڑکی کے مقابلے پر لڑکی کے ماں باپ، خاندان، اقدار، روایات، اخلاقیات اور اسلامی اجتماعیت کے حقوق کی حفاظت نہیں کرتی کیونکہ منشور انسانی حقوق میں کسی مذہبی، تاریخی، نسلی، لسانی، ثقافتی اجتماعیت کے حقوق ہی نہیں ہوتے۔ منشور میں صرف فرد کے حقوق ہیں۔ یہ منشور کسی اجتماعیت کا قائل نہیں یہ آزادی کے عقیدے کی بات کرتا ہے۔ آزادی فرد کی ہوتی ہے لہٰذا حقوق بھی فرد کے ہوتے ہیں۔ اجتماعیت فرد نہیں لہٰذا اس کے کوئی حقوق نہیں۔ اگر ماں باپ، خاندان، قبیلہ بھاگنے والی لڑکی کی آزادی میں مداخلت کرے تو سپریم کورٹ سب کو گرفتار کرنے کا حکم دے گی کیونکہ یہ دوسرے کی آزادی میں مداخلت کر رہے ہیں۔ لڑکی ان کی بیٹی، بہن، نہیں دوسری Other ہے وہ تنہا Individual وجود ہے۔ آزاد فرد ہے جو چاہے کرے۔

یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کے سو سے زیادہ فیصلوں میں لکھا گیا ہے کہ منشور انسانی حقوق کے تحت کسی فرد کی مذہبی آزادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ فرد اس منشور کے مطابق اپنی مذہبی آزادی کا استعمال کرے گا۔ مذہب کا صرف وہ حصہ قابل عمل ہے جو آزادی کے عقیدے سے ہم آہنگ ہو لیکن اگر فرد کا مذہب انسانی حقوق کے منشور کے خلاف کوئی حکم دیتا ہے تو مذہب کے اس حکم کو انسانی حقوق کا منشور برداشت نہیں کرے گا یعنی فرد کی مذہبی آزادی صرف منشور انسانی حقوق کے تابع ہے منشور انسانی حقوق آپ کے مذہب کے تابع نہیں ہے۔

بقیہ: پاکستان کی حالیہ معاشی مشکلات اور ان کا حل

امارت اسلامیہ افغانستان میں اس ضمن میں گراں قدر تجربات کیے جا رہے ہیں اور وہاں دو سال کے قلیل عرصہ میں معاشی استحکام قائم کر دیا گیا ہے۔ نہ وہاں افراط زر ہے، نہ فاقہ کشی اور نہ بے روزگاری۔ معیشت کے روابط بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام سے محدود کیے جا رہے ہیں اور نظاماتی استحکام محدود کر رہے ہیں۔ پاکستان کی اسلامی جماعتیں اس افغانی پیش رفت سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ انقلاب اسلامی افغانستان سے سیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہیں۔

غامدیت احمد جاوید

غامدی مکتبِ فکر کا تصورِ نظم قرآن (۱)

آج ایک خاص موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا ہے اور وہ موضوع ہے مکتب فراہی کا وہ تصورِ نظم قرآن جو اپنی تکمیل اور اپنے تمام اطلاقات کے ساتھ ظاہر ہونے میں غامدی صاحب پر تمام ہو گیا۔ اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض کر دیتا ہوں تا کہ کچھ غلط فہمی پیدا نہ ہو وہ یہ کہ غامدی صاحب نے دین کی ایک مکمل تعبیر پیش کی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ انہوں نے دین کو اس کے تمام اہداف سمیت ایک تعبیر دی ہے اور وہ تعبیر اسی تصورِ نظم کی روشنی میں دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دین کے نام پر کوئی اور ایسی فکر سرِ دست موجود نہیں ہے جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ اس میں دین کی ایک نئی مکمل تعبیر پیش کی گئی ہے۔ اور یہ جس کو میں دین کی کلی تعبیر کہہ رہا ہوں اسے اگر ایک ڈسکورس کے طور پر لیا جائے تو اس یونیورس آف ڈسکورس کو اندر باہر سے ایک نیا پن غامدی صاحب اور ان کے استاد کے ہاتھوں سے فراہم ہوا ہے اور وہ نیا پن ایسا ہے کہ جسے اگر مجموعی طور پر قبول کر لیا جائے تو ہماری دینی روایت جو دین کیا ہے؟ کا جواب فراہم کرتی ہے وہ دینی روایت نا قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ اور اس نئی تعبیر کو قبول کرنے کا نتیجہ اس کے سوا مجھے محسوس نہیں ہوتا، ذہنی طور پر بھی اور مشاہدے کی سطح پر بھی، کہ دین نے گویا اپنا مکمل تعارف موقوف رکھا ہوا تھا وہ اب بیان میں آیا ہے تو اس کے نتیجے میں ہمارے سلف اور ان سے منقول تفسیریں اور تعبیریں وغیرہ یہ سب نہ صرف یہ کہ اوجھل ہو جاتی ہیں بلکہ غلط قرار پاتی ہیں۔ یعنی روایتِ دین کو اپنی مجموعی صورت میں، اپنے تمام بنیادی اجزاء سمیت، اس تعبیر کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو وہ لغو اور غیر دینی قرار پاتی ہے۔

اسی کا ایک نتیجہ یہ ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک اس تعبیر کے نتیجے میں عجیب طرح کا ادعا پیدا ہو گیا ہے اور وہ ادعا بعض بدیہی سطحوں پر، کسی دلیل کا مطالبہ کیے بغیر، خلافِ دین یا مخالفِ دین ہے اور یہ فکر صحیح اور غلط کی کسوٹی بن گئی ہے۔ غامدی صاحب ایک اچھے خاصے طبقے

---

(۱) یہ ٹرانسکرپشن ادارے نے کرائی ہے اور احمد جاوید صاحب کو نہیں دکھائی جا سکی۔ مدیر

کے لیے صحیح اور غلط ہی نہیں بلکہ حق و باطل میں فرقان کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ان کی باتوں کو سند کی حیثیت دی جا رہی ہے بلکہ بعض جگہوں پر دی جا چکی ہے۔

ظاہر ہے، مَیں غامدی صاحب کا دوست ہوں اور ان شاء اللہ مرتے دم تک دوست رہوں گا۔ مجھے دوستی کے آداب آتے ہیں اور مَیں ان کا بہت مداح ہوں، ان کے اخلاق اور ان کے بہت سارے محاسن جو میری نظر میں ہیں ان کا بہت مداح ہی نہیں ہوں بلکہ انہیں رشک کی نظر سے دیکھتا ہوں کہ کاش یہ اوصاف یہ باطنی اخلاق مجھے بھی نصیب ہو جاتے۔ آج کی گفتگو میں ہرگز کوئی پہلو کسی شخصیت کو گرانے کا نہیں ہے۔ غامدی صاحب یا کسی کی بھی نیت کو پہچاننے کا دعویٰ کرنے کا بھی نہیں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کس کی نیت کیا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ آدمی کے رویوں سے، آدمی کے پورے نظامِ عمل سے، اس کی تحریروں سے، اس کے بنائے ہوئے انتظامی پروٹوکول سے کوئی نتیجہ اخذ کر لیا جائے جیسے کوئی نفسیات کا ماہر ہے وہ شخصیت پہ حکم لگاتا ہے۔ کوئی سماجیات کا ماہر ہے وہ اس فکر کے سوشل اثرات کو زیر بحث لاتے ہوئے اس فکر کے ماننے والوں کی شخصیت کا بھی جائزہ لینے لگتا ہے تو یہ نیت پہچاننے کا عمل نہیں ہے اور نہ ہی دعویٰ ہے۔ یہ صرف اپنی اس دلیل کو کہ اس تعبیری کل میں دینی نفسیات وغیرہ کا یعنی سٹینڈرڈ رلیجس سائیکی کا لحاظ نہ رکھنے سے یہ نتائج نکل رہے ہیں یا تعبیر کے ماننے والوں میں عمومی طور پر دکھائی دیتے ہیں تو اس میں کسی کی نیت کے بارے میں ہم کوئی حکم نہیں لگا رہے، یہ کسی کی کردار کشی نہیں ہے۔ اور ہم ایسی اگر کوئی مثالیں دیں گے بھی تو اس میں ہم کسی کا نام نہیں لیں گے۔

اس حوالے سے تمہیداً ایک بات کہتا ہوں کہ یہ فکر مغرب کے تصورِ آزادی سے ملتے جلتے تصورِ آزادی پر استوار ہے اور اس کے شواہد ہم رفتہ رفتہ پیش کریں گے۔ انسانوں کے بارے میں مغرب نے جو تصورات وقتاً فوقتاً دیے ہیں اور اس وقت جو کرنٹ مغربی تصورِ انسان ہے وہ پوری طرح اپنی بائنڈنگ حالت میں اس فکر پر اور اس فکر سے متاثر لوگوں کی شخصیت پر مسلط اور ان کی نفسیات میں سرایت کیا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس فکر سے متاثر ایک شخص کی تحریر میری نظر سے گزری جس میں وہ صاحب اس بات پر اِترا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کو دینی تعلیم نہیں دی۔ اور جب بچے نے ان سے پوچھا کہ ہمارا دین سچا

ہے یا فلاں دین سچا ہے؟ تو موصوف فخر یہ فرماتے ہیں کہ یہ فیصلہ تم خود کرنا۔ تو وہ جو باپ کی اور والدین کی ذمہ داری ہے تربیت اولاد کے سلسلے میں، اولاد کو دین سکھانے کے سلسلے میں اور اولاد کی دینی تربیت کو اس کی تربیت کے دیگر حصوں پر غالب رکھنے کی، یہ جیسے اس کا مذاق اڑایا گیا ہے کہ مَیں انہیں وہاں بھی لے گیا، مزاروں پر بھی لے گیا، اِدھر اُدھر سب جگہ لے گیا تاکہ یہ لوگ پوری آزادی کے ساتھ اپنے لیے یہ فیصلہ کریں جب سمجھ داری کی عمر کو پہنچیں کہ ہمیں کون سا دین منتخب کرنا ہے، ہمیں مسلمان رہنا ہے یا نہیں رہنا ہے؟ ہمیں اللہ کو ماننا ہے یا نہیں ماننا ہے؟ یہ اگرچہ اس تحریر کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے مستنبط ایک نتیجہ ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تو ان باتوں پر، اس آزادروی پر اس تصورِ انسان کے جو وہاں کا ہے، اس کی اندھی تقلید پر اس طرح سے اِترا کر باتیں کرنا اس فکر میں گندھی ہوئی ایک آزادی پسندی کا شاخسانہ ہے۔ اسی طرح کی اور بہت ساری مثالیں ہیں۔

پھر یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن یہ کہتا ہے، سنت اسے کہتے ہیں، دین کا مقصود یہ ہے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے اور شروع شروع میں ایک دین دار آدمی کو جو غیر عالِم ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے حُسن ظن کو کہاں تک قائم رکھے؟ تو میں نے ان چیزوں سے، بہت سارے تجربات کے بعد، یہ محسوس کیا ہے کہ ان کا تصورِ اخلاق مغرب کا تصورِ اخلاق ہے اور یہ چنگیز خان کی کج خلقی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، کہیں زیادہ مضر ہے تو میں نے بھی اپنا اسلوب بدل لیا ہے کہ جو لوگ اس طرح سے بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں تو ان کو ان کی اوقات یاد دلائی جائے۔ غصہ آتا ہے تو غصہ ظاہر کیا جائے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ طبیعت میں دین کے راسخ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ میرے جذبات یعنی اللہ کے لیے نفرت اور اللہ کے لیے محبت اگر اس سورس سے وجود پا رہے ہوں تو ان کا اظہار ضروری ہے اور جو جس طرح کے رویے، جواب اور لہجے کا مستحق ہو اس کو اُسی طرح سے جواب دینا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رویوں سے ہم آہنگ ہونے کی علامت بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے۔

تو خیر یہ باتیں ہم غامدی صاحب کے حوالے سے تھوڑی کرنا چاہتے ہیں غامدی صاحب جیسا تحمل تو اللہ ہمارے بہت سارے علماء کو عطا فرمائے، ان جیسی رواداری نصیب فرمائے تو وہ سب الگ باتیں ہیں، ان میں کہیں ان کی شخصیت پیش نظر نہیں ہے۔

ہمیں بس شکایت یہ ہے کہ مکتب فراہی میں سب امام پیدا ہو گئے ہیں، تو اس میں غامدی صاحب کا بہت ہاتھ ہے کہ شبلی امام، فراہی امام تو جب وہ انہیں امام کہتے ہیں تو جیسے آدمی کو خوشی ہوتی ہے، فخر ہوتا ہے۔ اصلاحی صاحب الاستاد الامام اور یہ اسی کا تسلسل ہے کہ اب غامدی صاحب بھی الاستاد الامام ہیں، اپنی منشا کے خلاف، لیکن اب وہ یقیناً سب سے بڑے امام ہیں۔ مَیں نے ایسی ایسی باتیں پڑھی ہیں کہ وہ آئندہ صدیوں کے امام ہیں تو اب یہ سب عجیب صورتِ حال ہے لیکن اس صورتِ حال کی پیدائش میں غامدی صاحب کا اپنے بڑوں کے بارے میں رویہ بھی جیسے شریکِ کار رہے۔

ہمارا آج کا موضوع ہے نظم کلام کا وہ تصور جو غامدی صاحب کے ہاں ہم نے دیکھا ہے، اس پر ہمارے تحفظات ہی نہیں کلی نوعیت کے اختلافات ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ان کی تعبیرات درست ہیں تو اسلام گویا دورِ اوّل سے بیسویں صدی تک اجنبی رہا ہے حالتِ غیاب میں رہا ہے، قرآن قاری کے انتظار میں رہا ہے، یہ جو جزوی مشابہتیں نکالی جاتی ہیں کہ یہ بات تو فلاں نے بھی پرانے زمانے میں کہی، یہ بات تو فلاں نے بھی پرانے زمانے میں کہی تو وہ ایسے ہی ہے کہ کسی گندم کے انبار میں بلا سوچے سمجھے کچھ گندم یا گھن نکال کر کے کہنا کہ یہ تو ان کے بورے میں بھی ہے اور تم میرے ذخیرے پر اعتراض کیوں کر رہے ہو، وہاں سے چار دانے نکال کر اپنے پورے خرمن کا جواز ثابت کرنا.... یہ رویہ ایک طرح سے غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ ایک تعبیرِ کل ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو پوری روایتِ تعبیر غلط ہے۔ اور اگر روایتِ تعبیر صحیح ہے ہمارے دین کی تعبیری روایت صحیح ہے اور تسلسل کے ساتھ اپنی صحت کی حفاظت بھی کرتی آ رہی ہے تو پھر یہ جو تعبیری ڈھانچہ ہے یہ بالکل غلط ہے۔ واضح بات ہے کہ یا تو یہ غلط ہے یا وہ غلط ہے اور ہم اس بات پر نہیں بھڑک اٹھے کہ یہ اس سے مختلف کیوں ہے؟ ہم ان شاء اللہ دکھائیں گے کہ ان کا سبب اختلاف کلی ہے، اس میں کیا کمزوریاں ہیں اور ان کے بنیادی اصولِ فہمِ قرآن کس طرح مس گائیڈنگ ہیں، کس طرح آرٹیفشل ہیں، کس طرح اپنے زمانے میں موجود خیالات سے غیر متوازن حد تک متاثر ہیں یعنی اس تصورِ نظم کے اطلاقات پوری شکل میں، اپنی جامعیت کے ساتھ، جو غامدی صاحب کے ہاں ہیں وہ اصلاحی صاحب کے ہاں بھی نہیں آئے۔ اور ان کی اطلاقی بناوٹ اور تشکیل میں اپنے زمانے کے

بالادست خیالات، رویوں اور مزاج کا واضح طور پر غلبہ نظر آتا ہے۔ہم ان پر ان شاءاللہ بات کریں گےلیکن اسے ازراہِ کرم کسی کے لیےتخریبی یا مناظرانہ کاروائی نہ سمجھا جائے۔جو ہم سمجھتے ہیں اسے نہایت مجبور ہو کر اب بیان کر رہے ہیں ورنہ برسوں سے بیان نہیں کیے لیکن مَیں محسوس کرتا ہوں کہ وہ وقت آ گیا ہےاور مجھے یہ بات اب جیسے دین کا تقاضا محسوس ہوتی ہے کہ اس فکر پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔تو اس کا آغاز کئی طرف سے ہوسکتا تھا لیکن میری سمجھ میں یہی آیا کہ ان کے تصورِ نظم پر جس تصورِ نظم کی اطلاقی تفصیلات غامدی صاحب نے فراہم کی ہیں بلکہ اس تصورِ نظم کی نمائندگی کا کام بھی انہوں نے کیا ہےجس کی وجہ سے اس تصور میں وہ بات نہیں رہی جو فراہی صاحب کے بیان میں تھی۔وہ تو بہت زبردست تھا وہ ایسا تھا کہ اب عربی بھی وہی کہتے ہیں کہ ابن عربی پر کیوں چڑھ دوڑتے ہیں؟ ابن عربی بھی کہتے ہیں کہ قرآن کے حقائق، دقائق اور حِکم جو ہیں وہ بہت گہرائی میں ہیں۔عام لوگ اور عام علماء اس تک نہیں پہنچ سکتے تو عین یہی بات فراہی صاحب کہتے ہیں تو اس میں ابن عربی پر باطنیت کا دھبہ لگ جائے اور یہاں اتنا بھی نہ کہا جا سکے کہ اعتبار تصور ہے یعنی تصورِ نظم ہمارے ذہن میں پیدا ہوا ہے ایک پیشگی تصور کی وجہ سے۔وہ پیشگی تصور یہ ہے کہ کلام میں ربط نظم یہ سب ہونا چاہیےتو ہم نے تو جو کتاب بھی پڑھی اس میں ہوتا ہے۔تو یہ جو پیشگی تصور ہے اس نے یہ اکسایا کہ بھئی قرآن میں بھی تو ہوگا تو اب یہ ہم نہیں پرکھ پائے کہ نظم کا یہ تصور جو ہم قرآن میں دریافت کرنا چاہتے ہیں کیا یہ تصور انسانی کلام سے پیدا ہوا ہے؟ کیا کلامِ الٰہی اس تصورِ نظم کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، اس پر ہم نے، میری رائے میں، زیادہ بےتعصب ہو کر غور نہیں کیا۔تو وہ بھی رفتہ رفتہ عرض کریں گے کہ کس طرح یہ تصورِ نظم، چاہے وہ کہیں بھی بیان ہوا ہے، اگر یہ تصورِ نظم قرآن فہمی کی واحد شرط بن جائے تو یہ قرآن کے ساتھ ظلم ہے۔گویا مَیں اپنے ذہن کے قوانین فہم کو کلام اللہ پر وارد کر رہا ہوں تو اسی وجہ سے میری رائے تا حال یہی ہے کہ یہ تصورِ نظم باہر سے وارد کیا گیا ہے قرآن پر، قرآن سے لیا نہیں گیا ہے۔اس کی تفصیل ان شاءاللہ آگے آئے گی۔

میں نے غامدی صاحب کی کتاب 'میزان' سے جو ان کا بہت مستند مجموعہ ہےاور وہ اس پر نظرِ ثانی بھی کرتے رہتے ہیں، تو اس میں سے جہاں انہوں نے اس تصورِ نظم پر روشنی ڈالی ہے جس کو فہم القرآن کی شرط بنا کر انہوں نے قرآن کو سمجھا اور سمجھایا ہےتو اس فصل کو لے کر مَیں قول

بہ قول تبصرہ کروں گا۔تو اس میں غامدی صاحب کی جو ترتیب ہے ہم اسی کے ساتھ چلیں گے۔تو غامدی صاحب شروع میں فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر سورۃ کا ایک متعین نظام ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الگ الگ اور متفرق روایات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک موضوع ہے اور اس کی تمام آیتیں نہایت ترتیب اور مناسبت کے ساتھ اس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ سورۃ کے اس موضوع کو سامنے رکھ کر جب اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور موضوع کی رعایت سے اس کا نظام پوری طرح واضح ہو جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت حسین وحدت بن جاتی ہے۔ان کا انداز شاعرانہ ہے لیکن شاعری میں ان کی دسترس چونکہ کمزور ہے اس لیے حسین وحدت میں چھپے ہوئے قبح کو شاید انہوں نے محسوس نہیں کیا۔

اسی بات کو غامدی صاحب نے دوسری جگہ زیادہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر سورۃ کا ایک موضوع ہوتا ہے جو ان تمام اجزاء کے لیے ایک رشتۂ وحدت کی حیثیت رکھتا ہے جن سے سورۃ میں مضمون کی تالیف وتشکیل ہوتی ہے۔ غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ اس موضوع کو ہم روح کی طرح سورۃ کے پورے وجود میں سرایت کیے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ جملہ بھی شاعرانہ ہے۔ایسا کلام میں ممکن ہی نہیں ہوتا کہ اس کا ایک موضوع متحقق ہو بھی جائے تو وہ اس پورے سورۃ کے لفظ لفظ میں سرایت کیے ہوئے دکھائی دے۔مطلب ایسا ممکن نہیں ہے یہ شاعرانہ سی بات ہے۔تو قرآن کے سلسلہ میں شاعرانہ بات اصول کے طور پر نہیں کہنی چاہیے۔

تو اب اس پر جو ہمارا تبصرہ ہے وہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی ہر سورۃ کا ایک متعین نظمِ کلام ہے تو اسے مخفی نہیں رہنا چاہیے، متعین ہمیشہ حالتِ اظہار میں ہوگا حالتِ اخفاء میں نہیں ہوگا، حالتِ صراحت میں ہوگا حالتِ ابہام میں نہیں ہوگا بلکہ وہ کلام میں سب سے زیادہ ظاہر ہوگا۔ جو بھی اس کلام میں متعین ہے وہ اس کلام میں اظہارات میں سب سے زیادہ قوی اظہار کے طور پر موجود ہوگا جو پہلی ہی نظر میں دکھائی دے گا، اس کے لیے تحقیق یا تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔تو یہ نظام اگر جو ہے متعین ہے تو اسے ہر ایک پر، ہر قاری پر یکساں طور پر ظاہر ہونا چاہیے۔یعنی یہ ثبوت وجودی کے طور پر ظاہر ہونا چاہیے۔متعین کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثابت بالوجود ہے۔دوسری بات جو انہوں نے فرمائی یہ کہ تمام آیتیں اس موضوع کے تابع ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ جب موضوع ہی دلالتِ قطعی سے یعنی قطعیت کے ساتھ غیر مبہم صراحت کے ساتھ

واضح نہیں ہے کہ موضوع کی روایت سے سورۃ کا نظام پوری طرح واضح ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک ججمنٹ ہے جو ان کے نزدیک اپنی کنسٹرکشن میں غلطی کا احتمال بھی نہیں رکھتا، قائل کے لیے، مصنف کے لیے۔ تو اتنے شدید تیقن کی فضاء کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر موضوع ہی واضح نہیں ہے، پوری طرح غیر مبہم اور خلافاتِ فہم سے بے نیازی کی حالت میں، تو پھر اس سے سورۃ کا پورا نظام واضح ہو جانا یہ ایک مغالطہ ہے اور خطرناک مغالطہ ہے اس پورے تصورِ نظم میں جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ اس سے کلامِ الٰہی ہمارے مفروضہ اصول میں مقید ہو جاتا ہے، یہ کلام الٰہی کے لیے بائنڈنگ بن جاتا ہے تو یہ صورت انسانی کلام میں تو ہو سکتی ہے کہ ٹیکسٹ ریڈنگ کے کچھ ضوابط و قوانین ہیں جو جنرلائز ہیں، تقریباً یونیورسل ہیں یا کسی روایت میں مانے ہوئے ہیں۔ تو ان قوانین کو کسوٹی کے طور پر جیسے محدود یعنی لمٹ کر دینے والے اصول کے طور پر وارد کیا جاتا ہے۔ شخصیت پر بھی کیا جائے گا، فردوسی پر بھی کیا جائے گا لیکن یہ کہ یہ کام کلامِ الٰہی پر اگر کیا جائے گا تو اس میں ظاہر ہے بہت خطرات ہیں۔

اگلی بات کہ اپنے طور پر کسی متعین نظام اور متعین موضوع کی رعایت کیے بغیر بھی وہ تیقن اور تحکم مجھے اجازت نہیں دیتا اور اس میں ایک اضافیت داخل ہو جاتی ہے، اعتبار داخل ہو جاتا ہے، ظن داخل ہو جاتا ہے۔ تو جب میں نے بالکل اسی طرح کہ قرآن میں غواصی کی اور مجھے ایک نظم برآمد ہوتا ہوا محسوس ہو گیا اور میں اس پر مطمئن بھی ہوں۔ اور اسی طرح اس نظم کو اپنے تئیں حاصل کر لینے کے بعد مَیں نے پھر اس کا متعین موضوع سورتوں کے متعین موضوعات جیسے خود بہ خود ہی حاصل کر لیے۔ تو اس فضا میں اس میں سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔ متعین نظام کا جو تعین ہے وہ میرے ذہن نے کیا ہے اور متعین موضوع بھی میرے ذہن میں متعین اور موضوع ہونے کی تعریف کو پورا کرتا ہے تو اس کی رعایت کیے بغیر بھی میں اس کو نہ مانوں کہ بھئی مجھے تو کوئی نظم نہیں ملا یعنی ان معنوں میں کہ یہ والا متعین نظم مجھے نہیں ملا کہ جس کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی اور جس سے الگ ہٹ کے قرآن میں ربط آیات وغیرہ کے عنوان سے جو بھی تلاش کیا جائے گا وہ غلط ہوگا۔ اب اتنے بڑے تحکم کے ساتھ قائم ہونے والے تصورِ ذہنی کو فرض کیا کہ مَیں نہیں مانتا اور میں سادہ طریقے سے قرآن حکیم پڑھتا ہوں اور سمجھ سمجھ کے پڑھتا ہوں۔ یعنی سمجھنا اخذ ہدایت کے لیے ہوتا ہے وہ عرفانِ حقائق کے لیے نہیں ہوتا، تو ایک

طالبِ ہدایت اپنے ربّ کا کلام پڑھ رہا ہے، آمادگی کے ساتھ، انفعال کے ساتھ اور محتاجی کے ساتھ اور وہ کسی بھی نظم اور موضوع وغیرہ کو جاننے کے بعد انکار کر دیتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو پھر وہ بھی کلامِ الٰہی میں کارفرما وحدت جو وحدت فی الکثرت ہے اُسے پا لیتا ہے، اُسے دیکھ لیتا ہے۔ دنیا میں کوئی تدبر والا قاری ایسا ہو نہیں سکتا یعنی اللہ سے تعلق کو اور اپنے تزکیہ کو مقصود بنانے والا کوئی مخلص مسلمان جو تدبر کی صلاحیت اور فہمِ قرآن کا ایک معیاری ملکہ رکھتا ہو کلماتِ قرآنی کے فہم کا تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اُسے کلامِ الٰہی میں ایک وحدت فی الکثرت دکھائی نہ دے اور وہ وحدت فی الکثرت میں وحدت مطلق ہے اور کثرت بدلتی رہتی ہے۔ قرآن کو اس تناظر میں دیکھتے کہ وہ مؤثر ہو تاکہ قرآن کی اصل وحدت اس کا متکلم ہے اور اس کے احکام، اس کی حکمتیں، اس کی تسبیحیں اور اس کے واقعات سب کثرت ہیں۔ جنہیں کہتے ہیں متفرق آیات یا احکام وغیرہ تو وہ متفرقات بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ جو وحدتِ متکلم ہے اپنے کلام کے معانی کا واحد سورس ہے وہ برقرار رہتا ہے مطلب یہ کوئی ایسی ناگزیر ضرورت نہیں ہے تو مطلب کوئی قاری ایسا نہیں ہوتا جو قرآن میں کارفرما وحدت سے جاہل ہو، بے خبر ہو یا اندھا ہو۔

دوسرا جو حوالہ ہے وہ ہے اصلاحی صاحب کا۔ غامدی صاحب ان کو کہتے ہیں الاستاذ الامام نے فرمایا۔ ظاہر ہے وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن یہ ذرا مبالغہ ہے۔ اصلاحی صاحب فرما رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک تو نظم کی، نظام القرآن کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے یعنی ہمارے تصورِ نظم کے واسطے سے، تو اس پر کیا تبصرہ کرے آدمی؟ جہاں اتنا حصر ہو، اتنا تیقن اور تحکم ہو تو اب یہ علمی رویہ بھی نہیں ہے بات کہنے کا۔ بہرحال ہمارا پہلا احساس تو یہی ہے کہ یہ مبالغہ ہے اور یہ عبارت آرائی ہے، یہ کوئی علمی بات نہیں ہے۔ اور اس میں مبالغہ بھی ایسا ہے کہ سادہ نہیں ہے۔ مبالغہ میں یہ خطرات، چاہے احتمالِ قوی کے درجے ہی میں ہوں، چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ خطرات یہ ہیں کہ جو نظم تحقیق اور باریک بینی سے دریافت کیا جائے وہ صحت کا امکان بھی رکھتا ہو تو بھی اعتباری تو ہے قطعی اور یقینی نہیں ہے۔ وہ متن کے ساتھ وہ عینیت نہیں رکھتا جس پر یہ لوگ اڑے ہوئے ہیں کہ یہ تصورِ نظم قرآن سے Identical ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ قرآن سے Draw ہی نہیں تو آئیڈینٹیکل کہاں سے ہوگا؟ یہ تو قرآن پر امپوز کیا گیا ہے۔ اس طرح کے

فقرے جب وہ سنتے ہیں تو اس سے یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی ذرا زور سے یہ دعویٰ کر دیں حالانکہ جو اعتباری ہے وہ قطعی کا عین نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ ایک اعتباری ججمنٹ کو، قضیے کو، فہم قرآن کی شرط لازم بنا دینا اور کہنا کہ رسائی اگر ہوسکتی ہے تو اس کے واسطے سے ہوسکتی ہے تو اس طرح شرطِ لازم بنا دینا یہ اپنی حد سے تجاوز ہے۔ یہ پیغمبری کا لہجہ ہے اور یہ حصر، یہ مشروطیت قرآن کا ادب ملحوظ رکھنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا کہ ان کے ہاں نہیں ہے ادب مَیں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جملہ جہاں پہنچے گا تو ان کے ماننے والوں میں یہ بھی پیدا کرسکتا ہے کہ وہ قرآن سے جیسے کھلواڑ شروع کر دیں اور یہ اپنی حد سے تجاوز ہے کہ یہ بندے کا کلام نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ قرآن کے علوم اور حکمت تک رسائی اس نظم کے بغیر ممکن ہی نہیں تو یہ ایک چلتا ہوا فقرہ ہے جو تاثراتی ہے۔ اس کے کوئی معانی نہیں ہیں۔ یہ محض ایک بڑھک ہے تو علوم اور حکمت قرآن کے علوم اور حکمت اور ان تک رسائی یہ سب چیزیں جو ہیں جیسے آرائشی الفاظ کی طرح ہیں۔ ان کا Content قابل دریافت نہیں ہے اور پھر یہ کہ قرآن کے کون سے علوم؟ تو پھر ایک نئی بحث چھڑ جائے گی۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک کلیشے ہے جو اس فکر والوں میں محاورہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس فقرے کا تجزیہ کیا جائے تو اندر سے اعتبارات اور مفروضوں کے سوا کچھ نہیں نکلتا کیونکہ یہ رسائی جو حاصل کر کے دکھاتے ہیں وہ معمولی ذہن کے اعتبارات اور مفروضوں سے لدی ہوئی نظر آتی ہے یہ ہم ان شاء اللہ کسی وقت عرض کریں گے، اسی طرح حوالے دے کر۔

یہ حوالہ نمبر ۳ ہے یہ بھی اصلاحی صاحب کا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب، اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے، روشن رکھے، فرماتے ہیں کہ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن پڑھے گا یہ ذہن میں رہے کہ نظم یہاں مجرد نظم نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے ہمارے تصورِ نظم، تو جو بھی نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور مفرد قسم کی ہدایات ہیں۔ اصلاحی صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ مطلب یہ دعویٰ واقعاتی شہادت سے ردّ ہو جاتا ہے۔ ہماری تفسیری روایت کا جو بھی سرسری سا جائزہ لے وہ اس دعوے

میں چھپی ہوئی غلطی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ لوگوں نے کسی ڈھلے ڈھلائے تصورِ نظم کی پابندی کیے بغیر، اس کی رعایت رکھے بغیر، قرآن میں جو ہدایت کی کلیت پر دلالت کرنے والے اجزاء ہیں ان کو اسی نسبت سے دریافت کر کے دکھایا ہے اور شاید ہی ہمارے بڑوں میں سے کسی کی بھی تفسیر ایسے وصف سے خالی ہو۔ تو یہ دعویٰ ویسے ہی صحیح نہیں ہے۔ اصلاحی صاحب مزے کے آدمی ہیں لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کر دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان سے الجھن بھی ہوتی ہے اور کبھی ہنسی بھی آتی ہے۔ تو آپ فرما رہے ہیں، مثال دیکھیے کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات وخواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزاء سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دے دے۔ تو اس میں ظاہر ہے زمین وآسمان کا فرق ہے حقیقت یہ ہے کہ بہت زیادہ خوداعتمادی بعض مرتبہ مضحکہ خیز نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس کی مثال یہ ایک فقرہ ہے۔ یہ ایک عامیانہ سی مثال ہے۔ کتاب المفردات کم لوگ سمجھتے ہیں۔ طب یونانی کے نصاب میں ایک کتاب المفردات ہوتی ہے۔ اس میں الگ الگ جڑی بوٹیوں کے خواص لکھے ہوتے ہیں یعنی جن کو ملا کے ترتیب دے کر کوئی حکیم نسخہ بناتا ہے۔ اور وہ کتابیں پھر دوسری ہوتی ہیں جو بیاضیں کہلاتی ہیں جن میں مرکبات ہوتے ہیں یعنی مفردات کو ملا کر دوا بنانے کا طریقہ۔ تو جڑی بوٹیوں کے نام دیکھ کر جڑی بوٹی کے خواص دیکھ کر، آدمی حکیم نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ مثال عامیانہ بھی ہے، سرے سے غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی ہے بلکہ خود اصلاحی صاحب ہی کے مدعا کے خلاف جاتی ہے۔ اس مثال سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل میں قرآن کتاب المفردات ہے یعنی بظاہر دیکھنے میں نظم کے بغیر۔ دیکھو قرآن کتاب المفردات ہے اور ایک حکیم حاذق ان مفردات کو اس طرح ترکیب دیتا ہے کہ یہ سب ایک خاص وحدت میں ڈھل کر، خاص مرکب میں ڈھل کر گویا کیمیا بن جاتے ہیں یعنی ہر مرض کا اعلاج بن جاتے ہیں۔ تو طب کی کتاب المفردات کا اصل میں یہی مصرف ہے اس میں مرکبات کا بیان نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے کتاب المفردات کی یہ مثال ٹھیک نہیں بیٹھتی اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کو حالت ترکیبی دے کر کیمیا بنانا نفس کے لیے یہ کام خارج سے ہوتا ہے تو مطلب یہ ایک بلنڈر سا محسوس ہوتا ہے اور جو بھی اردو کا محاورہ سمجھتا ہے یا ادب سے مَس رکھتا ہے تو وہ اس سے یہی مطلب نکالے گا۔

غامدیت پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

قابل قبول دینی اختلاف اور نا قابل قبول دینی اختلافات میں فرق

علمی اختلافات میں ریڈ لائن کیا ہے؟

بسلسلہ غامدی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی گمراہی

پچھلے شمارے میں ہمارا اداریہ پڑھ کر ایک صاحب نے لکھا ہے کہ:

غامدی صاحب اور ان کے ہم نوا اپنے کام کو اجتہاد اور تجدید کا کام سمجھتے ہیں اور علماء کے ساتھ اپنے اختلاف کو اسی طرح کا اختلاف باور کراتے ہیں جس طرح کا اختلاف علماء باہم اپنے مسالک میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ تو آپ فرمائیے کہ جب آپ غامدی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کو متجدد اور گمراہ کہتے ہیں اور ان کے اختلاف کو نارمل یا قابل قبول اختلاف نہیں سمجھتے تو سوال یہ ہے کہ آپ کے نزدیک قابل قبول اختلاف اور نا قابل قبول اختلاف (یا گمراہی) میں ریڈ لائن کیا ہے؟ کیسے پتا چلے کہ یہ اختلاف قابل قبول ہے اور یہ اختلاف نا قابل قبول ہے؟

جواب

ہمارے ملک کے تینوں دینی مکاتبِ فکر (حنفی دیوبندی، حنفی بریلوی اور اہلحدیث) ہماری رائے میں اہل سنت و جماعت میں شامل ہیں اور ان کے درمیان اختلافات فروعی، جزوی اور اجتہادی نوعیت کے ہیں۔ ان تینوں کے درمیان اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں لہٰذا ان مکاتب فکر کا اختلاف قابل قبول اختلاف ہے۔ متجددین خصوصاً غامدی صاحب اور عام اہلِ سنت میں فرق یہ ہے کہ غامدی صاحب کا اختلاف اہلِ سنت سے فروعی نہیں بلکہ اصولی ہے مثلاً:

۱۔ غامدی صاحب کے نزدیک ان کے مزعومہ نظم قرآن کو تسلیم کیے بغیر قرآن کی صحیح تفسیر کی ہی نہیں جا سکتی گویا امت کے مفسرین نے آج تک جتنی تفسیریں لکھی ہیں وہ سب غلط ہیں اور ان علماء میں سے کوئی آج تک قرآن کو صحیح سمجھا ہی نہیں۔

۲۔ ان کی سنت کی تعریف اہل سنت و جماعت سے مختلف ہے یعنی امت پچھلے چودہ سو برس سے جس چیز کو سنت سمجھتی آ رہی ہے وہ اسے سنت ہی نہیں سمجھتے۔ اسی لیے اہل سنت کے

جمہور علماء انہیں منکرینِ سنت میں شمار کرتے ہیں۔

۳۔ وہ دین کے ہر جزو کی تشریح اور اجتہادی رائے فکرِ مغرب کی روشنی میں قائم کرتے ہیں جو تجدد اور بدعت ہے اور قرآن وسنت کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران ۳: ۸۵] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔"[۱]

۴۔ ان کا مجموعی کام دین کی ایک نئی تعبیر ہے کیونکہ جو دین اور جو دینی وعلمی روایت پچھلے چودہ سو سال سے امت میں چلی آرہی ہے اور جسے بآسانی جمہور امت کی رائے یا امت کی اجماعی رائے کہا جا سکتا ہے، غامدی صاحب کا تصورِ دین اس کے خلاف ہے۔ تو یہ بات نقل وعقل دونوں کے خلاف ہے اور منطقی طور پر اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ تمام امت چودہ سو سال تک دین کو نہیں سمجھ سکی اور صرف غامدی صاحب ہی اس کو صحیح سمجھے ہیں۔

۵۔ مسیح موعودؑ کی آمد کا انکار کرنا، رجم کا انکار کرنا، جہاد کو نہ ماننا، مسلمان خواتین کا غیر مسلموں سے نکاح جائز قرار دینا، تصویر کو حلال قرار دینا، اسلامی ریاست کو تسلیم نہ کرنا، حدود اللہ کی غلط تشریح کرنا (زنا کی سزا کو آسان بنانا اور شادی شدہ زانی کی سزا کوڑے قرار دینا) اور دوسرے بیسیوں نہیں سیکڑوں مسائل ایسے ہیں جن میں غامدی صاحب کا مؤقف اجماعِ امت اور جمہور اہل علم کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ کہ اہل سنت کے درمیان اجتہادی امور میں اختلاف یا فروع میں اختلاف جائز ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی کو گمراہ نہیں کہا جا سکتا لیکن غامدی صاحب کا جمہور اہل سنت سے اختلاف فروعی واجتہادی امور میں نہیں اصولی وبنیادی ہے اور یہی وہ ریڈ لائن ہے جسے وہ عبور کرتے ہیں جب وہ قرآن وسنت اور اجماع کے بارے میں امت کے چودہ سو سالہ مؤقف کو رد کرتے ہیں اور دین کی نئی کلی تعبیر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی روشنی میں کرتے ہیں جو غیرِ اسلام ہے، مردود ہے، تجدد اور بدعت ہے اور ناقابل قبول ہے۔ امید ہے ہمارا مؤقف واضح ہو گیا ہوگا۔

---

[۱] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۴۹۳

غامدیت　　پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

بسلسلہ متجددین اور غامدی صاحب کی گمراہی

انذار و اصلاح کے اسلوب میں فرق

غامدی صاحب کی بطور متجدد گمراہی کے بارے میں پچھلے شمارے کے ہمارے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا ہے کہ:

ہم آپ کو فارن کوالی فائڈ پروفیسر سمجھتے تھے لیکن آپ کا اسلوب غامدی صاحب کے حوالے سے متشدد مولویوں جیسا ہے۔ اسے ہرگز معتدل علمی رویہ نہیں کہا جا سکتا۔ آخر کو اہلِ مغرب اہلِ کتاب ہیں جن کے بارے میں کتاب وسنت نے عام کفار کے مقابلے میں خاصی رعایتیں دی ہیں۔ پھر ہم مسلمان مشنری امت ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اہل مغرب کو بلکہ ساری دنیائے کفر کو اسلام کی دعوت دیں اور یہ دعوت ظاہر ہے لٹھ مارنے کے انداز میں نہیں دی جاسکتی۔ علماء خود تو یہ کام کر نہیں رہے اور غامدی صاحب جب یہ کرتے ہیں تو آپ انہیں متجدد اور گمراہ کہہ کر ان پر تبرا کرتے ہیں؟ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب علوم وفنون اور تحقیق وٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہے اور ان میدانوں میں ہمیں اس سے استفادہ کرنے میں جھجھک نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن آپ لٹھ لے کر مغربی تہذیب اور غامدی صاحب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور انہیں متجدد، وگمراہ اور بدعتی کہنے پر مصر ہیں۔

جواب

ہم نے اپنے پچھلے مضمون میں بھی یہ بات کہی تھی کہ ایک ہے انذار، تنبیہ اور دفعِ شر کا مؤقف اور دوسرا ہے اصلاحی مؤقف۔ ہمارے فہم کی حد تک یہ دونوں جائز ہیں اور دونوں کی ضرورت ہے۔ ہمارا ذاتی مؤقف انذار، تنبیہ اور دفعِ شر کا ہے تاکہ لوگ متجددین خصوصاً غامدی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی حقیقت کو سمجھیں، ان کی پیروی سے بچیں اور ان کے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ ہمارا مؤقف ہے، کراچی سے سید خالد جامعی صاحب کا مؤقف ہے اور سارے مکاتب فکر کے ان علماء کرام کا مؤقف ہے جن کو غامدی صاحب کو پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہے۔ ظاہر ہے ہم اپنی بات زور دے کر کہتے ہیں، جذباتی انداز میں بھی کہتے ہیں اور

اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

اس کے برعکس ایک اصلاحی مؤقف ہے۔ اصلاحی مؤقف والے حضرات بھی (مثلاً احمد جاوید صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب) غامدی صاحب کے مؤقف کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنا لہجہ نرم اور اسلوب مصالحانہ رکھتے ہیں تا کہ مکالمہ کا دروازہ کھلا رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ احمد جاوید صاحب کی حال ہی میں ایک ویڈیو سامنے آئی ہے جس میں وہ غامدی صاحب کے اخلاق وتحمل کی تعریف کرتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں کہ میرا مؤقف کسی کی ذات کے خلاف نہیں ہے، مَیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غامدی صاحب نے نظمِ قرآن کے حوالے سے جو مؤقف پیش کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح ملی مجلس شرعی کے اجلاس میں جب علماء نے متفقہ طور پر غامدی صاحب کی گمراہی کی رائے دی تو مولانا زاہد الراشدی صاحب نے، جو وہاں موجود تھے، اس سے اختلاف نہیں کیا لیکن جب انہوں نے غامدی صاحب سے سنت کے بارے میں تحریری مباحثہ کیا تو اختلاف رائے کے باوجود ان کا اسلوب نرم اور مفاہمانہ تھا۔ اسی طرح اپنے بیٹے عمار ناصر کے بارے میں انہوں نے سخت رویہ نہیں اپنایا بلکہ نرمی کی تا کہ مکالمے اور تبادلۂ خیال کی گنجائش باقی رہے کہ اسی سے اصلاح کا امکان باقی رہ سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہم لوگ اگر غامدی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف زوردار مؤقف اپناتے ہیں تو ہمارے پیش نظر بھی دینی مصلحت ہے، ہمارا کسی سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں ہے اور اگر اصلاح کے جو یا اپنا اسلوب نرم رکھتے ہیں تو مصلحتاً اس کی بھی گنجائش ہے بشرطیکہ حقائق کا انکار نہ کیا جائے۔

جہاں تک مغربی تہذیب کے غلط ہی نہیں کفر ہونے اور دین ماسوا اللہ ہونے کا تعلق ہے تو بدقسمتی سے کالجوں یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں مغربی فکر وتہذیب کی تفہیم وتجزیے کا مضمون چونکہ پڑھایا نہیں جاتا اس لیے پروفیسرز اور مدارس کے علماء ومدرسین اس تہذیب کے غلط ہونے، گمراہ کن ہونے اور اسلام سے متضاد ہونے بلکہ دینِ کفر ہونے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اس کے لیے ہم اور ہمارے احباب مقدور بھر اپنی آواز اٹھا رہے ہیں، اس پر کافی لٹریچر بھی موجود ہے اور اس کے کچھ اثرات بھی معاشرے میں نظر آنے لگے ہیں۔ آخر میں ہم یہی کہیں گے کہ "اللّٰھُمَّ ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه۔" آمین یا ربّ العٰلمین۔

پاکستانیات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

پاکستان کی حالیہ معاشی مشکلات اور ان کا حل

اس بحران کا حل ساورن ڈیفالٹ ہے جس کے لیے ہماری اسٹیبلشمنٹ
اور سیکولر سیاسی جماعتیں تیار نہیں

دینی سیاسی جماعتوں کو متحد ہو کر اپنا محدود کردار ضرور ادا کرنا چاہیے

پاکستان کی معیشت dualistic ہے۔ اس کا ایک حصہ documented ہے۔ اس حصہ میں بڑا صنعتی، زرعی اور کاروباری شعبہ اور حکومتی خرچہ اور سرمایہ کاری شامل ہے۔ دوسرا حصہ informal معیشت کا ہے جس میں وہ پیداواری اور خدمتی ادارے شامل ہیں جو خود مختار ہیں۔ informal معیشت شہروں اور دیہاتوں دونوں جگہ موجود ہے۔ اور بنیادی طور پر undocumented ہے۔ یہ نہ ڈائریکٹ ٹیکس دیتی ہے نہ سرکاری اعانت وصول کرتی ہے لیکن بالواسطہ ٹیکسز کے ذریعے فارمل معیشت سے متصل ہے۔

پاکستان کی حالیہ مشکلات کو نظاماتی بحران نہیں کہنا چاہیے کیوں کہ یہ مشکلات پورے معاشی نظام کا احاطہ نہیں کرتیں۔ بنیادی طور پر بحران documented (سرکاری اور نجی شعبوں) میں پیوست ہے اور informal شعبہ بحرانی کیفیات سے قدرے محفوظ ہے۔ ان معنوں میں پاکستانی معیشت کی ساخت نیم سرمایہ دارانہ ہے اور بیش تر لاطینی امریکی اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک سے مختلف ہے۔

Documented شعبہ کی بحرانی کیفیت

Documented شعبہ کی پیداواری شرح 23-2022ء میں اصلاً منفی رہی۔ سرمایہ کاری بھی منجمد رہی اور 24-2023ء میں اس شرح میں اضافہ کی کوئی توقع نہیں۔ حکومتی تخمینی خسارہ بہت بڑھ گیا ہے اور بیرونی توازن ادائیگی میں بھی اضافہ ہوا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ documented معیشت stagflation کا شکار ہے یعنی ایسی کیفیت میں ہے کہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں لیکن پیداواری شرحِ نمو منفی ہے۔

ان زبوں حالات کی بنیادی وجہ documented معیشت کی عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ماتحتی اور پیوستگی ہے اور اس ماتحتی پیوستگی میں ہنوز اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان 1988ء کے بعد سے (جب سے بینظیر بھٹو نے آئی ایم ایف سے سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ معاہدہ کیا) آج تک ہر سال بے تحاشا قرضے لیے اور آج ان قرضوں پر سود اور اصل کی ادائیگیاں حکومتی اخراجات کا سب سے بڑا حصہ بن گئی ہیں۔ ان ادائیگیوں کو جاری رکھنے کے لیے حکومت کو محصولات بڑھانے اور رعایتیں گھٹانے پڑتے ہیں جس سے پیداواری نمو گرتی ہے اور کاروباری خرچے میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی بڑھتی ہوئی شرح افراطِ زر کی اصل وجہ ہے۔

بینظیر کی پہلی حکومت نے ہم پر آئی ایم ایف کی حاکمیت مسلط کر دی اور اس کے بعد آنے والے تمام حکام (بالاستثنا ضیاء الحق مرحوم) نے آئی ایم ایف کا یہ حکومتی تسلط مزید مستحکم کر دیا۔ آئی ایم ایف وہ سامراجی ادارہ ہے جو سامراجی ممالک اور سرمایہ دارانہ اداروں کے مالیاتی تحفظ کو فروغ دینے کے لیے کارفرما ہے۔ یہ ہر مقروض حکومت پر دباؤ ڈالتا ہے کہ بین الاقوامی قرضوں پر سود اور اصل کی ادائیگیاں ہر قیمت پر جاری رکھیں اور ایسی پالیسیاں اپنائیں جو ملکی معیشت کی عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ماتحتی پیوستگی کو فروغ دے۔

آئی ایم ایف کا حالیہ نو ماہ کا توسیعی پروگرام پاکستانی معیشت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ملکی وسائل بین الاقوامی سودی اور اصلی ادائیگیوں کے لیے وقف کر دیں۔ زرمبادلہ کی شرح تبدل پر سے تمام پابندیاں اٹھالیں اور درآمدات کی سطح کو بڑھنے سے نہ روکیں۔ ان تمام اقدام سے شرح افراطِ زر میں اضافہ اور پیداواری شرح میں کمی واقع ہوتی ہے۔ آئی ایم ایف اس عمل کو سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کہتا ہے۔ اپنی سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ سے پاکستانی معیشت کی سرمایہ دارانہ نظاماتی پیوستگی مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔

سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پالیسیوں کا اثر informal شعبہ پر محدود ہے لیکن بلاواسطہ حکومتی محصولات میں اضافہ ہوتا ہے۔ حکومتی اعانتوں میں جو کمی واقع ہوتی ہے وہ informal شعبہ کو بھی متاثر کرتی ہے کیونکہ شرح افراطِ زر میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سی ایسی اشیا موجود ہیں جو ڈاکومنٹڈ اور انفارمل سیکٹر دونوں استعمال کرتے ہیں (بجلی، گیس، پٹرول، کھاد وغیرہ)۔

پالیسی سازوں کا ردعمل

پاکستان کے معاشی پالیسی ساز عالمی سرمایہ کے آلہ کار ہیں۔ یہ بات تمام سیکولر سیاسی جماعتوں (پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم، مسلم لیگ، تحریک انصاف) اور انتظامیہ کے ہر دھڑے کے بارے میں کہنا درست ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف کے ادوار میں آئی ایم ایف سے سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ معاہدے کیے گئے اور مشرف نے بھی یہی کیا اور آج بھی کوئی سیاسی جماعت یا انتظامی دھڑا آئی ایم ایف کے سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کی منسوخی کا مطالبہ نہیں کرتا۔

ظاہر ہے کہ کساد بازاری سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم فی الفور بیرونی سودی اور اصلی ادائیگیوں کو منسوخ کر دیں یا کم از کم کچھ عرصہ کے لیے معطل کر دیں۔ اس سے ملکی وسائل میں بے اندازہ اضافہ ہوگا۔ نہ محصولات بڑھانے کی ضرورت رہے گی نہ اعانتیں کم کرنے کی۔ شرح افراطِ زر گرے گی اور پیداواری شرح میں اضافہ ہوگا۔

2001ء سے لے کر 2021ء تک 67 ممالک نے سرکاری طور پر ساورن ڈیفالٹ کیا ہے اور ان کی معیشت پر اس کا کوئی تباہ کن منفی اثر نہیں پڑا۔ حالیہ مثالیں سری لنکا، ارجنٹینا اور لبنان کی ہیں جن کی نہ درآمدات میں کمی آئی اور نہ بین الاقوامی ترسیل زر کے راستے مسدود ہوئے۔ پاکستان کے قرضہ دینے والے ممالک (چین) اور دوسرے اداروں (ورلڈ بینک، اے ڈی بی) سے قرضہ جاتی تخفیفی معاہدہ کرنا بالکل ممکن ہے۔

آخر پاکستانی پالیسی سازوں کے لیے ڈیفالٹ شجر ممنوعہ کیوں ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان پالیسی سازوں نے اربوں کھربوں ڈالر غیر ملکی بینکوں اور فنڈز میں لگا رکھے ہیں اور جو اصل قوت ان کے اقتدار کو محفوظ کیے ہوئے وہ سامراج (امریکی یا چینی) ہے۔ یہ جن کے غلام ہیں ان کی تابعداری سے فرار حاصل کرنا نہیں چاہتے لہٰذا ڈیفالٹ کے فائدے اور نقصان کا ذکر ہمارے پالیسی ڈائیلاگ میں سرے سے موجود نہیں۔ پاکستانی پالیسی ساز عالمی سرمایہ دارانہ نظاماتی ماتحتی کو مزید بڑھانے کے خواہاں ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک قانون بورڈ آف انویسٹمنٹ امنڈمنٹ ایکٹ 2023ء منظور کیا ہے جس کے تحت حکومتی اثاثوں کو بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے

ہاتھوں فروخت کرنے کی واضح منصوبہ بندی کی گئی ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی پالیسیاں اختیار نہیں کی جائیں گی جو عالمی سرمایہ دارانہ مفادات کے برخلاف ہوں۔ یعنی ہم کبھی صنعتوں کو قومیانے کا تصور نہ کریں گے، ارتکاز سرمایہ کی تحدید نہیں کریں گے، کارپوریٹ ٹیکس معتدل رکھیں گے اور بیرونی سرمایہ کاروں کو وسیع مراعات اور قانونی چھوٹ دیں گے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہمارے پالیسی ساز بین الاقوامی نظام سرمایہ داری سے ایسے وقت میں امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں جب یہ نظام خود کساد بازاری اور انجماد کا شکار ہے۔ چین تک کی پیداواری شرح نمو اوسطاً 8 فیصد سالانہ سے گر کر 2023ء میں صرف ڈھائی فیصد کی توقع ہے۔ آئی ایم ایف کے حالیہ تخمینوں کے مطابق عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی 2023ء کی شرح نمو بھی صرف 2 فیصد ہوگی۔ سرمایہ دارانہ نظام شدید ماحولیاتی ابتری کا شکار ہے اور عالمی مالیاتی نظام بھی نہایت غیر مستحکم ہے۔ ایسے میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا سے توقعات وابستہ کرنا اور امید رکھنا کہ بین الاقوامی سرمایہ کاری بڑے پیمانے پر پاکستان میں آئے گی اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عملاً پاکستانی پالیسی ساز ملکی معاشی مشکلات کو جاری رکھنے پر اس لیے مطمئن ہیں کہ یہ ان کے اقتدار کو محفوظ رکھتی ہیں اور ان کی سامراجی تابعداری کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اسلامی جماعتیں کیا کریں

قومی معاشی مشکلات کے تناظر میں ہماری جماعتوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ متنازعہ ہے۔ تحریک لبیک اس ضمن میں آج بالکل خاموش ہے لیکن 2019ء میں اس نے آئی ایم ایف کے ESAF پروگرام کے خلاف ایک وائٹ پیپر شائع کیا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام بحیثیت پی ڈی ایم کے رہنما کے عملاً موجودہ پالیسی کی جانشین رہی ہے۔ جماعت اسلامی نے کبھی ڈیفالٹ کی حمایت نہیں کی نہ باقاعدہ آئی ایف ایم کے پروگرام کو رد کیا لیکن اس پروگرام کے تنفیذ کے اثرات کی مذمت کرتی رہی ہے۔

سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ 2024ء کے انتخابات سے قبل یہ تینوں جماعتیں متحد ہو کر آئی ایم ایف کے پروگرام کی توسیع اور سامراجی نظاماتی تابعداری کی پرزور مخالفت کریں

اور اگر ہمیں انتخابات میں کامیابی ہو (یعنی 30 سے 35 نمائندے منتخب ہو جائیں تو پارلیمان میں ایک سامراج مخالف دھڑا قائم کریں جو مستقلاً سامراجی تابعداری کے خلاف مزاحمت کرتا رہے۔ اس سے سامراجی تابعداری کی راہ میں رکاوٹیں تو کھڑی کی جاسکتی ہیں لیکن جب تک سامراجی باجگزاری کی گرفت حکومت پر مضبوط ہے یہ تابعداری ختم نہیں کی جاسکتی۔

سامراجی تابعداری کو متاثر کرنے کے لیے عوامی تحرک ضروری ہے۔ جماعت اسلامی اس نوعیت کا تحرک پیدا کرنے کی جستجو عوامی مظاہروں کے ذریعہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن یہ زیادہ موثر نہیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ لاطینی امریکی ممالک کے برخلاف پاکستان کا سیاسی نظام مالیاتی ارتباط کی بنیاد پر منظم ہے۔ عوامی دھڑے اپنے مخصوص اشرافی مربیوں سے منسلک ہیں اور اجتماعی مفاداتی تحرک کا احساس محدود ہے۔ ہر عوامی دھڑا اپنے ذاتی مفادات کو نظاماتی مفادات پر ترجیح دیتا ہے۔ ان نظاماتی مفادات کی جو تشریح جماعت اسلامی عوامی مظاہروں کے ذریعہ کرتی ہے وہ سرمایہ دارانہ ہوتی ہے اور عوام میں سرمایہ دارانہ عقلیت اور اقدار کا نفوذ محدود ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مظاہروں کے شرکا اور مخلصین دین کو انقلابی بنیادوں پر منظم کرنے کی کوئی اسکیم جماعت اسلامی کے مدنظر نہیں۔ ہر مظاہرہ کے بعد مظاہرین منتشر ہو جاتے ہیں اور ان میں اسلامی مذہبیت کی روح بیدار نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے مظاہروں اور اجتماعیتوں کا تسلسل برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور ہم محض بے اثر مطالباتی نعرے لگاتے رہ جاتے ہیں۔

ملکی نظام میں اسلامی سیاسی جدوجہد کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس نے مخلصین دین کو مقامی سطح پر بااقتدار بنانے کی اداراتی صف بندی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ انفارمل معیشت کو منظم کرنے اور مقتدر کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مسجد کی سطح پر ایک ملک گیر ایسا نظام تمویل مرتب کیا جائے جس کا دائرہ کار بازار اور محلہ کی معاشی زندگی کی پر محیط ہو جو ڈاکومنٹڈ شعبہ سے انفارمل شعبہ کی تطبیق کی کوشش کرے، حلال رزق کو فروغ دے، حلال دولت افزائی کے بڑھانے کی راہ ہموار کرے اور حکومتی محصولیاتی اور ڈاکومنٹیشن کی گرفت کو کمزور کرے۔ یوں ملک گیر سطح پر ایک ایسا انفارمل شعبہ بروئے کار گاہے گاہے آجائے گا جو بتدریج عالمی سرمایہ دارانہ نظاماتی گرفت سے آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۳)

ڈاکٹر احمد امتنان کاشف [1]

تفہیم مغرب

مغربی تہذیب ایک دلدل ہے(۱)
اس سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

عصر حاضر میں جو تہذیب غالب ہے وہ مغربی تہذیب ہے۔ یہ جدیدیت کا دوسرا فیز ہے۔ پہلی دفعہ یہ تقریباً پانچ سو قبل مسیح میں یونان سے شروع ہوا اور پانچ سو عیسوی تک قائم رہا۔ یہ گریکو رومن تہذیب (Greeko Roman Civilization) تھی۔ ہزار سال بعد اس پر عیسائی تہذیب نے غلبہ حاصل کرلیا۔ یہ بھی لگ بھک ایک ہزار سال غالب رہی۔ اس ہزار سالہ عیسائی تہذیب کو دوبارہ اسی سابقہ تہذیب نے زیر کرلیا جس کو خود عیسائیت نے اس سے پہلے شکست دی تھی۔ یہ جدیدیت کی نشاۃ ثانیہ تھی، جسے "رے نیسان (Renaissance)" بھی کہتے ہیں۔ اس تہذیب کی روح اگر ایک لفظ میں بیان کرنی ہو تو وہ "عیاشی" ہے۔ اس کو تمتع فی الارض بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ نفس امارہ کا اظہار ہے جس میں خواہشات بت بن جاتی ہیں اور رذیل طبائع کے لیے یہ بے انتہا پرکشش ہے، اس لیے مسیحی دنیا اس کی اسیر ہوگئی اور یہ تہذیب بہت مضبوط وتوانا حالت میں مغرب سے باہر کی دنیا کو دعوت عیش وعشرت دینے لگی۔ بیشتر طبقات اور مذاہب نے بہت کم مزاحمت کی اور جدیدیت یا ماڈرنٹی کے سحر میں گرفتار ہوگئے۔

اب اس تہذیب کے مقابل صرف اور صرف عالم اسلام تھا جسے ہر حال میں اس سے اپنا دامن محفوظ رکھنا تھا کیونکہ جتنا واضح مابعد الطبیعیات، علمیت اور اقدار اسلام رکھتا ہے جو ایک تہذیب کی اصل طاقت ہوتی ہے اس کا دیگر مذاہب وطبقات سوچ بھی نہیں سکتے، اس لیے عالم اسلام کا ہی فرض منصبی تھا کہ اس تہذیب کو پسپا کرتے اور اسے دھکیل دیتے مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا۔

دو ڈھائی صدی قبل جب یہ تہذیب ہماری طرف بڑھ رہی تھی تب ہماری حکمت عملی دفاعی تھی یعنی امت کو تہذیبی میدان میں ایک دفاعی جنگ درپیش تھی مگر ہم اس موقع پر دفاع کا فریضہ سرانجام دینے میں بوجوہ ناکام رہے۔ اس کا بنیادی سبب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ

---

[1] ساہیوال

نے اپنے ایک قول میں واضح فرمایا تھا کہ "اگر تم اپنے دور کی جاہلیت کو نہیں سمجھو گے تو اپنے دین کی کڑیاں اکھیڑ دو گے"۔ جاہلیت کو سمجھنے میں اس بار جو خطاء ہوئی اس کے پیچھے اس جدید جاہلیت کا دجل تھا جس میں اس نے اپنی ہر چیز ہمارے سامنے اس انداز میں پیش کی کہ ہمیں اس کا مخالف اسلام ہونا غیر واضح رہا۔

یہ درست ہے کہ اس جاہلیت کا بھی عقیدہ یا مابعد الطبیعیاتی نظام بالکل موجود ہے مگر یہ دعوت کی بنیاد عقیدے کی بجائے تہذیبی اظہارات کو بناتے ہیں، جس سے ہمیں مغالطہ ہوتا ہے کہ اس سے ہمارے دین پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دراصل یہی اس تہذیب کی اصل واردات ہے جو ہماری شکست کا سبب بن گئی۔ جب ایک دفعہ ان کے تہذیبی اظہارات، معیارات اور قدروں کو کوئی مسلمان فرد یا اجتماع قبول کر لیتا ہے تو ان کا تہذیبی عمل یہاں خود بخود شروع ہو جاتا ہے، اس تہذیبی عمل کو عقیدے میں تبدیل کرنے میں کم از کم تین نسلیں لگ جاتی ہیں۔ ابتداء میں تمتع فی الارض، ترقی، تسخیرِ کائنات اور عیاشی وغیرہ کے حصول کے لیے اس تہذیب سے مصالحت کی تھی جس نے بالآخر تیسری نسل میں جا کر عقیدہ و علم کو ہی سرتاپا بدل کے رکھ دیا اِلّا مَنۡ رَحِمَ رَبِّی۔

آج امت مسلمہ ایک دلدل میں پھنس چکی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے پہلے ہم دلدل کے کنارے پر کھڑے تھے، تب بچاؤ کی حکمت عملی اور تھی جو ہم پوری طرح اختیار نہیں کر سکے، اُس وقت اس شر سے بچنا آسان تھا کیونکہ ہماری تہذیب بھی عملاً کھڑی تھی اور ہزار سال سے کھڑی تھی، ہمیں اپنی تہذیب پر قائم رہنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا اور یہ حملہ آور تہذیب ابھی ہمارے اندر داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ باہر سے ہی دستک دے رہی تھی۔ اس مرحلے پر ہم شکست کھا گئے، یہ جاہلی تہذیب ہمارے اندر گھس گئی اور ہمارا سب کچھ بدل دیا حتیٰ کہ سوچنے کے زاویے بھی بدل گئے، آج دوسو سال بعد ہماری پوزیشن اب وہ نہیں ہے جو اس وقت تھی۔ اب ہم دلدل میں موجود ہیں، اب بچاؤ کی حکمت عملی مختلف ہوگی۔ اس مضمون میں اسی چیز کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اسلام عقیدے کی دعوت دیتا ہے اور عقیدے ہی کی بنیاد

پر کسی بھی غیر مسلم کو داخل اسلام کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پہلے ہی قدم پر آنے والے کو کفر اور اسلام کی تفریق واضح طور پر سمجھ آ جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر وہ اسلام میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جبکہ جدیدیت کا معاملہ بالکل مختلف ہے، یہ عقیدے کی براہ راست دعوت نہیں دیتی بلکہ اپنے اظہارات و معیارات اور دنیوی نتائج کو بنیاد بنا کر لوگوں کو دعوت دیتی ہے، جس کی وجہ سے اس کا ایک الگ سے دین ہونا محسوس ہی نہیں ہوتا۔ یوں ابتدا میں وہ اسلام کے ساتھ ہی ماڈرنٹی کو برتتا ہے مگر آہستہ آہستہ ماڈرنٹی اس کے مسلم عقائد کو بدل دیتی ہے۔ یہ کام اس نسل میں نہیں ہوگا جس نے ماڈرنٹی کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ یہ چند نسلوں کے بعد ہوگا، نئی نسل اصل مسئلے کو سمجھ ہی نہیں سکے گی بلکہ اس کو اپنا ہی سچا دین بہت عجیب یا ناقابلِ عمل نظر آئے گا۔

(جاری ہے)

بقیہ: وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل

سائنسی انکشافات ہر آنے والے دن کے ساتھ کلمہ طیبہ کی صداقت و عظمت پر مہر ثبت کیے دیتے ہیں۔ انسان پر اعتراف حق کے لیے اتمام حجت بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اللہ کا انکار کرنے، عدم اطاعت کے لیے بدترین ابلیت کی ڈھٹائی درکار رہے۔ رواں رواں توحید کی گواہی دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ انگریز ماہر فلکیات ہرشل کی گواہی دیکھیے: جوں جوں علم کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے، ایسے محکم و قاطع دلائل و براہین میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جن سے ایک ازلی لامنتہا قدرت واختیار کے مالک خالق کا وجود ثابت ہو رہا ہے۔ یہ جو ماہرین طبقات الارض، ریاضی وفلکیات، علمائے طبیعیات (فزکس) مل کر علم کا ایک نہایت مضبوط محل تعمیر کر رہے ہیں یہ دراصل اللہ واحد کی عظمت کا محل ہے!

(یا ربی لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك)

﴿فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾﴾ (الجاثیہ: ۳۶، ۳۷)

تفہیم مغرب

عامرہ احسان[۱]

وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل

گزشتہ دنوں کائنات میں دو ستارے ٹکرا گئے لیکن اہل مغرب اس سے
سبق نہیں سیکھتے اور ان کا دھیان خالقِ کائنات کی طرف نہیں جاتا

ٹکّر، ٹکّر کی بات ہے۔ کیا ٹکرائے، کون ٹکرائے اور نتیجہ کیا نکلے؟ دو انسان ٹکرائیں۔ اگر ہلکی ٹکر ہو تو نیل پڑ سکتا ہے، ناک منہ سوج سکتا ہے، پٹھا کھنچ جائے گا اور خون بہہ جائے گا۔ زیادہ زور کی ٹکر ہو تو انٹاغفیل ہوں گے۔ رونا دھونا، شور شرابا، ایمبولینس کی پیں پیں اور بات بڑھ جائے تو پولیس کی زیں زیں۔ معاملے کی سنگینی رفع دفع کرنے کو نوٹ پس پردہ سرسرائیں گے۔

سیاسی پارٹیاں ٹکرائیں تو کباڑا عوام کا۔ ملکی معیشت کا۔ دھرنے، ٹریفک درہم برہم، فائرنگ، آتش زنی، سوشل میڈیائی بھبکیاں، اخباروں کی شہ سرخیاں، ٹاک شوئیاں۔

ملک ٹکرائیں تو متکبر ہاتھی اپنی قوت و جبروت کے نشے میں بدمست چھوٹے ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ہیروشیما، ناگاساکی برپا کر سکتے ہیں۔ یا ربّ چاہے تو لڑا دے ممولے کو شہ باز سے۔ یا کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر ہو جائے تو چھوٹا سا ملک پے در پے بڑی طاقتوں کو بھر بھر تابوت بھیجے اور تین سپر پاوروں کو زمین دوز کر دے! یہ کہانیاں تو ہم آپ کو اس چھوٹے سے سیارے پر آباد مخلوق کی ٹکروں کے فساد کی سنا رہے تھے۔ مگر اب دیکھیے، اللہ کی وسیع و عریض کائنات میں سب سے چھوٹے دو ستاروں کے باہم ٹکرا جانے کا معاملہ۔ کائنات میں ہیبت سے رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفاصیل لامتناہی ہیں۔ کائنات کے دور دراز گوشے میں ایک ننھا اور ایک منا ستارہ آپس میں ٹکرا گئے۔ (اگست ۲۰۱۷ء)

یہ ذات کے نیوٹران تھے۔ (جیسے ہمارے ہاں راجپوت، کشمیری، جاٹ وغیرہ ہوتے ہیں)۔ یہ کائنات کے اگرچہ سب سے چھوٹے مگر مادے کے اعتبار سے بے انتہا کثیف،

---

[۱] اسلام آباد سے معروف مصنفہ اور اسلامی دانشور

Density بے پناہ۔ اتنی کہ ستارے کے مولد کا چمچ بھر مادہ، ایک ارب ٹن سے زیادہ ہوگا۔ (ہماری محدود عقل میں تو وہ چمچہ ہی نہیں آ رہا جو اتنے کثیف مادے کا متحمل ہو سکے) ستارے کی سطح فولاد سے ۱۰ ارب گناہ زیادہ سخت ہوتی ہے۔ ہماری تو اتنی معلومات پر ہی مارے ہیبت کے گھگی بندھ گئی۔ ایسی تخلیقات کا خالق کیسا ہوگا! اللہ اکبر کبیراً۔

یہ اتنے بھاری بھرکم موٹے تازے، گول گپے ہٹے کٹے ستارے باہم ٹکرائے تو فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ اور ان کا ٹکرانا تھا کہ بے پناہ گاما شعاعوں کا برسٹ چھوٹا اور Shock Waves کی شکل میں ابل پڑا۔ ساتھ ہی سونے چاندی، پلوٹونیم، یورینیم کی بارش شروع ہوگئی۔ کھربوں ٹن سے زیادہ سونا! زمین کے مادے کی کل مقدار سے 100-40 گنا زیادہ! زمین کے مادے کی کل مقدار تقریباً 5.9 سیکس ٹِلین ٹن۔ (یعنی آپ ایک کے دائیں طرف 21 صفر لگائیں تو سیکس ٹِلین بنتا ہے۔) اس سے زمین جیسے 10 سیارے خالص سونے سے وجود میں آئے ہوں گے!

یہ خبر ناسا کی طرف سے رصد گاہوں میں موصول ہونے والی خبروں میں سے سائنس کی دنیا کی ایک یہ تہلکہ خیز خبر تھی۔ ہمارے سیکولر، امریکہ کے علوم وفنون پر ایسے میں عش عش کرتے غش کھانے لگتے ہیں۔ ہم جیسے مولویوں کو ایسی خبریں سنا کر ہماری کم علمی کا ماتم کرتے، مرثیے پڑھنے لگتے ہیں۔

مگر ذرا رکیے! کیا یہ وہی سب نہیں ہے کہ ان مختلف النوع علوم کی بنیاد ابن سینا، الفارابی، ابن جبیر، الخوارزمی، (ایک لامنتہا فہرست میں سے محض چند نام) نے رکھی۔ سپین، بغداد، اجرام فلکی کے مشاہدات رصد گاہوں کے مراکز تھے۔ یورپ تاریک دور (Dark Ages) میں جہالت میں ڈوبا، چرچوں، پادریوں، بادشاہوں کے ہاتھوں استحصال کا مارا ہوا تھا۔ اسی لیے جب مسلم سپین سے ہمارے علوم سمیٹ لیے تو مذہب دشمنی میں خدا سے ضد باندھ بیٹھا۔ آج تک اس بیمار منتقم نفسیات سے باہر نہ آ سکا۔ سو وہ ربّ تعالیٰ کی کبریائی، ان تخلیقات کے مشاہدے میں باور کرنے سے بھی قاصر ہے۔ عالم بالا، اجرام فلکی، ستارے سیارے، کہکشائیں! جامع مربوط محکم نظام جیسا اس کائنات کی تخلیق میں ہے، عین اتنا ہی عظیم محکم مربوط نظام زندگی، کامل واکمل اللہ نے انبیاء کے ذریعے برسرزمین انسانی دنیا کو جنت نظیر بنا

دینے کو عطا کیا ہے۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی وتقلید سے کور

اللہ آیاتِ کائنات (نشانیاں) دکھا کر کہتا ہے: ﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ ''یہ ہے اللہ! جو تمہارا ربّ ہے خالق ہر چیز کا۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے۔ پھر کدھر سے تم بہکے ہوئے جا رہے ہو۔'' (المومن: ۶۲)

اور وہ نعمتیں باور کرواتا ہے، زمین کو جائے قرار، آسمان کا (حسین وجمیل جگمگاتا) گنبد، عمدہ شکل صورت، پاکیزہ رزق (بے پناہ تنوع کا حامل)۔ پھر کہتا ہے: وہی اللہ ہے جو تمہارا ربّ ہے! بے حساب برکتوں والا ہے وہ کائنات کا ربّ (خلا میں سونا چاندی بکھیر دینے والا، قیمتی دھاتوں کی برسات تو دیکھو اور جانو! پہچانو!) وہی زندہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین (عبادت و بندگی، طرزِ زندگی، اطاعت وفرمانبرداری) کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ (المومن: ۶۵، ۶۴) یہ وہی سورۃ المومن ہے جس میں قوم فرعون میں فرعون کا مرتبے والا درباری (مومن آل فرعون) موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر ایمان لے آیا اور حق کی گواہی ببانگِ دہل برسرِ دربار (فرعون) دے دی۔ جیسے آج کوئی امریکی کانگریس میں، بھری کانگریس میں، اسلام کی گواہی دے دے! جیسی مارماڈیوک پکتھال نے برطانیہ کے عروج کے دور میں خلافتِ عثمانیہ کے حق میں (اسلام قبول کر کے) ڈٹ کر آواز اٹھائی۔ ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے لیے تقاریر کرتے اور مضامین لکھتے رہے۔ مگر یہ ہمارے مسلمان 'سیکولر' اپنی دانشوری کے ہاتھوں کھوئے گئے۔ ﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ﴾ تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ تاسف سے ہم بھی یہی پوچھتے ہیں۔ عظیم نشانیاں دیکھ کر اللہ کی بجائے انہیں امریکہ کی عظمت سوجھتی ہے! جو اللہ سے موسمیاتی تھپیڑے کھاتا (سمندری طوفان، بھڑکتی آگ) ہلکان ہوا پڑا ہے۔ جنت اور اس کے ذرین محلات، ہیرے جواہرات ٹکے دردِ دیوار کا مذاق اڑانے والے یہ دو ننھے سیاروں کی کہانی دیکھ لیں۔ کائناتی آتش بازی کا عظیم مظاہرہ! زمینی خلائی رصد گاہوں میں جس کی آوازیں موصول ہوئیں! جہنم پر شکوک وشبہات کے اظہار سے پہلے سورج (مرکز کا درجۂ حرارت 27 ملین فیرن

ہائٹ)اور بلیک ہول کی تفصیلات دیکھ لیں۔ یہ سب آج انسانی معلومات کی دسترس میں آ چکی ہیں۔ایک مہیب بلیک ہول وہ ہے جو ہماری کہکشاں کے مرکز میں ہے۔جو ہمارے سورج سے 40لاکھ گناہ بڑا ہے۔(وہ خلاء کے خطے جو کشش ثقل (اتنی بے پناہ) کے حامل ہیں کہ سبھی کچھ نگل جاتے ہیں)۔سائنس دانوں نے مزید ایک سب سے زیادہ طاقتور خلائی دھماکے کا مشاہدہ کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ یہ دھماکا، گیس کے بہت بڑے بہت بڑے بادل کو بہت بڑے بلیک ہول کے نگلنے سے ہوا ہے۔ یہ دھماکا زمین سے 8 ارب نوری سال کے فاصلے پر ہوا ہے! (ایک نوری سال میں روشنی 9.5 کھرب کلومیٹر فاصلہ طے کرتی ہے)

یہ اب تک مشاہدے میں آنے والے کسی بھی خلائی دھماکے سے 10 گناہ زیادہ روشن تھا جس کی روشنی 3 سال سے زیادہ مدت گزرنے پر بھی برقرار ہے۔دھماکے کا حجم ہمارے نظام شمسی سے 100 گناہ زیادہ اور اس سے پیدا ہونے والی روشنی ہمارے سورج کی روشنی سے 2 ہزار ارب گنا زیادہ تھی۔ ماہرین کو احساس ہوا کہ یہ بہت ہی زیادہ حیران کن ہے۔اس سے بھی بڑھ کر حیران و پریشان کن امر یہ ہے کہ یہ ماہرین اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کو پہچاننے سے قاصر ہیں!

یہ جدید ترین معلومات کی چند لائنیں انبیاء کی اللہ کے حضور خشیت اور اللہ کی ان پر ہیبت کا راز بیان کرتی ہیں۔خصوصاً نبی کریم ﷺ کا اس وسیع و عریض کائنات کے بیچ معراج کا سفر! آپ کے مشاہدات میں براہ راست کیا کچھ نہ آیا ہوگا۔فرشتے،اللہ کی کبریائی کے مشاہد۔ جو(فرشتے)اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب وروز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے۔ (الانبیاء۱۹،۲۰)۔ یہ کہتے ہیں، رحمان اولاد رکھتا ہے،سبحان اللہ، وہ(فرشتے) تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔....وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو،اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔اور جو ان میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں،تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے۔ (الانبیاء۲۶تا۲۹)۔(بقیہ صفحہ نمبر:۶۵)

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر انعام اللہ﴿۱﴾

مسلمانوں کی بلادِ کفار کو منتقلی حرام نہیں

اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اہل مغرب مسلمان ہو رہے ہیں اور ممکن ہے وہی مسلم نشأۃ ثانیہ کے نقیب بن کر اٹھیں

* نائن الیون (11-9-2001) میں پاکستانی کردار سے بلاد کفار سے واپس آنے والوں کو حد درجہ مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ پاکستان ''اسلام کے قلعے'' کی بجائے ''اسلام کا قید خانہ'' ہے۔ یہ صورتِ حال تاحال جاری وساری ہے۔ اب دنیا میں ایک آدھ استثناء کے علاوہ کوئی خطہ ''بلادِ اسلام'' کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

* مابعد جدیدیت ہمیں ہائرارکی (Heirarchi) کی بجائے انارکی (Anarchism) کا درس دے رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر دنیا کے سیانے بہترین دماغوں کا شکار (Talent Hunt) اور ان ذہنوں کو اپنا وفادار (Talent Retain) رکھنے کا ہنر جانتے ہیں تو پھر یہ ''عالمگیریت'' ان ذہنوں کو کسی منافقانہ ملک کے قید خانے میں قید نہیں رہنے دے گی۔

* محترمہ مومنہ العظام صاحبہ کی تحریر سے پہلے بھی شرعی فتاویٰ تو موجود ہوں گے لیکن آج کے عالمی اشاریے ہمیں مثبت خبریں بھی دے رہے ہیں جیسے:

۱۔ اسلاموفوبیا کے باوجود مغرب میں سب سے زیادہ قبول کیا جانے والا نظریہ اسلام ہی ہے۔ ان کا اسلام شعوری ہی ہوتا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر شفیع گیلانی صاحب کے گیلپ پول پر البرہان میں خدشات کے باوجود دنیا کی آٹھ ارب آبادی میں سے دو ارب مسلمان اپنے بچوں کو دین پر ہی دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ باقی میں سے دو ارب الحادی اور دو ارب عیسائی (نام نہاد) والدین کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ زندگی میں آئندہ کیا دین اختیار کرتے ہیں۔ یہ تاثر اسلام کے روشن مستقبل کا پیش خیمہ

﴿۱﴾ اٹک

ہے۔

۳۔ مغرب میں جہاں مسلمان ایک معاشرے (کمیونٹی) کی صورت میں موجود ہیں وہاں صورتِ حال باقی نام نہاد اسلامی ملکوں سے زیادہ بہتر ہے۔ ان کے بچے خود آگاہ اور اپنی شناخت اور دین کو زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ جہاں مسلمانوں نے اپنی اجتماعیّتوں کو چھوڑا، وہاں ''بھیڑیا اکیلی بکری کھا جاتا ہے'' کے مصداق وہ سانحات ہوئے جو تحقیق میں بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ برطانیہ میں پچھلے سال سب سے زیادہ رکھا جانے والا نام ''محمد'' تھا۔ برطانیہ میں وہاں کے جم پل مسلم بچوں میں از خود قرآن حفظ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یورپ میں جہاں شدت سے اسلام کی مذمت کی جاتی ہے وہاں اس کے ردّعمل میں زیادہ شعور کے ساتھ اسلام کے ساتھ وابستگی کا اظہار ہو رہا ہے۔

۵۔ ہماری بیمار نفسیات اور محدود ذہن رب کائنات کے انسانیت کے بارے میں فیصلوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہم ایک دوسرے سے ان جنّات کی طرح سوال کر سکتے ہیں جنہوں نے کہا تھا:

﴿وَّاَنَّا لَا نَدۡرِیۡۤ اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَ بِہِمۡ رَبُّہُمۡ رَشَدًا ﴿۱۰﴾﴾

[الجن ۷۲:۱۰]

''اور یہ کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے اہل زمین کے حق میں برائی مقصود ہے یا ان کے پروردگار نے ان کی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔''

بلادِ کفار میں بھی اللہ کی ہی مخلوق بستی ہے۔ وہاں پر بھی قلب منیب اور قلب سلیم ضرور موجود ہوں گے۔ خالق اپنی مغربی مخلوق کی سعید روحوں کو خود اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اب اگر مغرب نے ہماری نااہلیوں کی وجہ سے دنیا کی امامت سنبھال لی ہے، تو وہ ہنر سیکھے بغیر جو مدینہ، بغداد، غرناطہ اور استنبول میں سکھایا گیا تھا، ہم اپنے ذہنوں (Brains) کو واپس نہیں لا سکتے۔

۱۵۸۰ء میں استنبول میں دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ کو بوجوہ ہم نے خود منہدم کر ڈالا۔ پھر ایک صدی کے اندر ۱۶۷۵ء میں انگلینڈ میں گرین وچ کی پہاڑی پر برطانوی رصدگاہ کا قیام ظہور میں آیا اور جلد ہی دنیا کے وقت کے پیمانے ''جی ایم ٹی'' کے مطابق درست

ہونے لگے۔ اب پھر سے مدینہ، اسلام آباد یا کابل کو علم ودانش کا مرکز بنائے بغیر وہنوں کی واپسی (Brain Drain) محال ہے۔

۶۔ پاکستان (نام نہاد بلدِ اسلام) میں مغرب نواز ایچی سن، کراچی گرامر سکول، کیتھیڈرل سکول اور آکسفورڈ کے فضلاء نے ہی حکومت کرنی ہے تو درمیانے درجے کے عوام کے ذہین بچوں کو ان کا غلام اور ان کی حکومتوں کا قیدی بنائے رکھنا درست نہیں۔ انہیں آزاد کر دیجیے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ وہ ان منافق عسکری، سیاسی اور مذہبی وڈیروں کی چاکری کرتے پھریں۔ اگر وہ اس ''صنم کدے'' کے بتوں کو توڑ نہیں سکتے تو پھر اس صنم کدے میں منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے کی بجائے اور ان کے ہیروؤں کو اپنا ہیرو بنانے کی بجائے، اُسی دیس میں جا کر اپنے آپ کو ناپ تول ڈالیں جہاں کی زبان ہی انگریزی ہے۔

میاں نجار بھی چھیلے گئے
بہت ہی تیز ہیں یورپ کے رندے

انہیں گنبد افلاک میں آزاد کر دیجیے تا کہ وہ دنیا میں برابری کی سطح پر کسی بھی دنیوی بت (مستکبرین، مترفین، مطففین) کو چیلنج کر سکیں اور خودی کی پرورش اور لذت نمود کا مظاہرہ کر سکیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ یہاں کی ظاہری اور باطنی غلاظتوں کے ڈھیروں میں پنپنے کی کوشش کریں۔ انہیں یہ اعتماد دیں کہ اگر اس چھوٹی سی زمین کے علاوہ بھی کائنات کے کسی خطے میں جانا پڑ جائے تو یہی سمجھنا ہے کہ۔

ہر مُلک، مُلکِ ماست کہ مِلکِ خدائے ماست

اپنے مقاصد کے حصول کے حوالے سے ہمیں یہ احساس بھی رہنا چاہیے کہ ہم جو پرانی نسل کے لوگ ہیں اس ملک میں ناکام رہے ہیں۔ ہم خود مجرم ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری نئی نسل میں کتنے ہی بچے ''سائبرستان'' ہجرت کر چکے ہیں۔ جب تک ہماری سرزمین پر منافقانہ قیادتیں، مجرمانہ روشیں اور منتشر اسلامی جمعیتیں موجود ہیں صورتِ حال نہیں بدلے گی۔ ہزار فتوؤں کے باوجود، بہترین فصلیں، چاہے وہ سروں کی ہوں یا پھلوں کی، وہ ذہین طاقتور کے سرچشموں اور مرکزوں کو جاتی رہیں گی۔

تبصرۂ کتب　　　مدیر

کتاب نما

فقہی اختلاف و تطبیق ۔ امام شعرانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کا تقابلی مطالعہ

فرقہ پرستی کے موجودہ ماحول میں فقہی اختلافات میں نرمی اور تطبیق کی بات کرنا ایک عظیم کام ہے جس کا بیڑا پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ڈاکٹر سعید احمد سعیدی صاحب نے اٹھایا ہے۔ یہ ان کی دلچسپی کا مستقل موضوع ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنی ایک اور کتاب بعنوان ''امام عبدالوہاب شعرانیؒ کے منہج تطبیق کی عصری معنویت'' بھی انہوں نے ایک ملاقات میں ہمیں عطا کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ اہل علم وفقہ کو ان کے اس کام کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ کتابیں صبحِ نور پبلی کیشنز ، اردو بازار لاہور فون: 0321-4771504 سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

دینی مدارس اور معاشرتی رویوں میں ان کا کردار: از ڈاکٹر سیدہ مسعودہ شاہ

یہ کتاب پروفیسر صاحبہ کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں ان کے پیش نظر کوئٹہ/ بلوچستان کے دینی مدارس کا خصوصی مطالعہ کرنا تھا تاہم جو کام انہوں نے کیا ہے اس سے معاشرتی رویوں میں دینی مدارس کا عمومی کردار بھی سامنے آجاتا ہے۔ مصنفہ نے دینی مدارس کے روایتی نصاب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ترتیب وتدوین نو کی بات بھی کی ہے اور ثنویت کے خاتمے پر بھی زور دیا ہے تاکہ دینی مدارس اور ان کے فضلاء معاشرتی رویوں میں مثبت تبدیلی کے لیے زیادہ جامع اور مفید کردار ادا کرسکیں۔ کتاب اعلیٰ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور سے طلب کی جاسکتی ہے۔

مطبوعات العلم پبلشنگ سروسز/ جامعہ تبلیغ القرآن پشاور

پچھلی ایک دہائی میں یہ مظہر ابھر کر سامنے آیا ہے کہ دینی مدارس کے کئی فضلاء نے جدید

یونیورسٹیوں کا رخ کیا اور اسلامی علوم میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں۔اس سے ان کی فکر ونظر میں اعتدال پیدا ہوا اور کئی لوگوں نے اس سے کام کے کئی نئے راستے نکالے۔ایسے لوگوں میں سے ایک پشاور سے ہمارے دوست مولانا ڈاکٹر حشمت علی صافی ہیں جو نہ صرف ایک میڈیکل کالج میں علوم اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں بلکہ جامعہ تبلیغ القرآن پشاور کے کرتا دھرتا بھی ہیں۔انہوں نے نہ صرف دینی تعلیم کی بہتری کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں بلکہ ساتھ ہی جدید تعلیم کے ادارے بھی قائم کیے ہیں جو اسلامی تناظر میں مفید کام کر رہے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس وقت اس ادارے کی تیار کردہ تین کتابوں کا سیٹ ہے جو حفظ القرآن اور دینی مدارس کے طلبہ کے لیے پرائمری سطح کی اردو، انگریزی اور ریاضی (اردو میڈیم) کی نصابی کتب کے طور پر تیار کی گئی ہیں۔ان کتابوں کے مصنف ڈاکٹر ابوثاقب شکیل احمد ہیں جو ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی ہیں۔اسی ادارے نے ایک اور کتاب 'رفاہی ادارہ کیسے بنائیں؟' بھی شائع کی ہے۔اس سے پہلے اس ادارے نے ایک کتاب شائع کی تھی کہ 'دینی مدرسہ کیسے چلائیں؟'۔اس کے علاوہ بھی ادارہ نے طلبہ وطالبات کے لیے پیشہ ورانہ مہارت کے کئی دوسرے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔کتابوں کے حصول کے لیے العلم پبلشنگ سروسز عبدالغنی پلازہ، محلہ جنگی، قصہ خوانی پشاور شہر، فون: 0333-4532836 سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس از مولانا عبدالعزیز دہلویؒ

یہ ۳۲ صفحات کا ایک مختصر کتابچہ ہے جس میں مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے خلفائے راشدین اور اہل بیت کے فضائل پر مشتمل ۵۴ احادیث جمع کی ہیں۔اس پر مولانا مرزا حسن علی لکھنویؒ نے فوائد لکھے ہیں اور حواشی کے ساتھ اردو ترجمہ مولانا نظام الدین کرانویؒ نے کیا ہے جبکہ اس کی ترتیب جدید کا کام مولانا وقاص احمد سعید المتوکل نے کیا ہے۔اگر احادیث کی تخریج کر دی جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا ۔ برائے رابطہ دار الامین اُردو بازار، لاہور فون: 0312-4612774

transition from a liberal to an authoritarian democratic regime. It may do this by introducing constitutional amendments such as the Nation State Law of 2017 and the 2023 legislation to reduce the “independence” of the Israeli judiciary. In such cases the legislature uses executive authority and weakens the citizens’ access to fundamental liberal rights forcing the citizens to behave rationally – i.e. in accordance with the dominant authority’s conception of the “correct” strategy for maximization of the rate of capital accumulation. Islamic revolutionaries must realize that dilution of the provision of human rights does not normally weaken the rule of law of capital – instead it has strengthened it in both Israel and Bharat.

7. Authoritarian democracy is a populist regime. It is sustained by the popular support of the mobilized masses under a charismatic leader – Lenin, Mao, Sukarno, Modi. It is not a dictatorship. The masses enthusiastically support the transition from liberal to authoritarian democracy. This transition represents a collectivization of capitalist individuality at the national level. The collectivist capitalist citizen seeks freedom, equality, progress, not for himself but for all Jews or Hindus or Christian or Muslims. Deconstructing this collective individuality is the principle task of Islamic revolutionaries in authoritarian democracies. We must endeavor to persuade the common man to reject capitalist values – freedom, equality and progress – and to participate in the process of constructing a state order which is focused on the achievement of Falah in Akhirah not on the futile project of seeking to create heaven on earth.

democratic state structure is normally facilitated by the ideology of nationalism – either ethnic (as in Israel) or religious (as in Bharat). Therefore we must recognize nationalism as the main oppositional ideological force confronting Islam. Nationalism has corrupted Judaism in Israel (and in America) and Hinduism in Bharat. Muslim nationalism is a toxic poison which infiltrates into Islamic consciousness at the mass level. Currently in Pakistan there is no Islamic political party the political agenda of which is not dominated by Muslim nationalist tropes. The secular constitutional Pakistani state was created by a Muslim nationalist movement. If we are committed to a reconstruction of the state we must squarely face the ideological challenge posed by nationalism and expel all (Muslim) nationalist themes from Islamic revolutionary discourse.

5. Today major countries that are transitioning from liberal democratic to authoritarian democratic state structures (Israel, Bharat) are imperialist allies. This hasn't always been so as the cases of Nasser's Egypt and Nkrumah's Ghana illustrate. Liberalism remains a strong, though declining, ideological force in Western Europe and America but it is not powerful enough to override the geostrategic national interests of the main imperialist countries. So America does not complain about human rights violations in Israel or Bharat. We must understand that despite its nationalist rhetoric an authoritarian democratic regime (such as Imran Khan's Tehreek-i-Insaf government) can accept imperialist subordination.

6. Sometimes, as in Israel and Bharat, the parliament can itself be an instrument for achieving a

non-elected relatively permanent constituents of the state system – the bureaucracy, the judiciary, the military, the media, the corporation, the key players in global financial markets, are increasingly usurping political and administrative powers. As capital concentrates and centralizes it needs a strong state which alone can ensure systemic adherence to capitalist rationality.

2. Therefore our struggle against global capitalist order must be focused on deconstructing the essential power of the relatively permanent custodians of capitalist state power – the bureaucracy, the judiciary, the media, the corporation, what Imam Mohandes Bazargan once described as the play of parliament is becoming increasingly ineffective. Nevertheless the parliamentary power can be used to weaken the executive power of the relatively permanent constituents of capitalist states – the bureaucracy, the judiciary, the media, the corporation.

3. Deconstructing the institutional structure of a capitalist state is a long term project. It requires the mobilization and responsibilisation of a mass based ideological leadership which can gradually establish a network of grassroots foci of power – a state within a state – to which power can be transferred from constitutionally legitimated state institutions – the bureaucracy, the judiciary, the media, the corporation. A contemporary example of this is the Sangh Privar's establishment of a nationwide Shakha network which have increasingly subordinated state institutions in Bharat.

4. Transition from a liberal to an authoritarian

universalist, requiring a recognition of equal capitalist rights to all human beings. Thus when the modern secular Jew is confronted with Arab demands for equality he cannot act rationally. All the evidence is that in Israel (as in Bharat) his racial commitment triumphs over his commitment to liberal values.

The modern Jew regards all Muslims as terrorists or at least as the fellow travellers of Hamas and Hezbollah. Netanyahu is a modern Jew who skillfully exploits the racialist bias of the Jewish masses. He describes Arab Knesset leaders as “existential threat to Israel”. He has passed over 30 laws especially designed to promote denial of liberal rights to Muslims. In 2018 these laws were capped by the Basic Law of the nation state which according to the Muslim Knesset member Yousuf T. Jabareen “represents a death blow to Arab civil and constitutional rights”. The adoption of the Nation State Basic Law was overwhelmingly popular among the Jewish citizenry. The Nation State Law (2018) effectively abolishes the Green Line. All Muslims are now non-citizens in the Israeli state – those living in Israel proper and those living in the West Bank and Gaza.

The Palestinian Authority is on its death bed. Political representation in the Knesset has become meaningless. Military units are being deployed within Muslim towns. Jewish settlements are expanding on an exponential rate. The hopes of the Muslim modernists to gradually liberalize the Israeli state have collapsed comprehensively.

Lessons for Islamic Revolutionaries

1. Liberal democracy is dying – not just in Israel and Bharat but throughout the world. It is being replaced by authoritarian democracy. The non-representative,

In the past few decades liberal democratic tendencies have been flourishing among Western oriented Israeli Muslim intellectuals. A group of such intellectuals in 2007 published a series of “Vision Documents” calling for liberalization – the extension of liberal democratic rights to the Palestinians – of Israeli state policies and structures. This aroused virtually no support from the Muslim masses and was viewed with considerable hostility by the Jews who resented that these “good Arabs” (Western oriented persons) were also calling for a de- judaization of the Israeli state.

Israel does not have a constitution. The Knesset passes “Basic Laws”. From 2001 to 2005, three proposed Basic Laws were formulated all of which sought to strengthen the liberal orientation of state policy but all of them endorsed the conception of Israel as a Jewish state. No Arab individual or group was included in the drafting of these proposed basic laws. The publication of the “Vision” documents was an unsolicited response to these proposed basic laws. In 2007 Shin Bet, Israeli Security Organization, warned the Prime Minister that “the Muslims were becoming a genuine long term danger to the very existence of the state of Israel”.

European descendent Israelis – they constitute the dominant element in the Israeli elite – and the Western educated Israeli youth are torn between two mutually irreconcilable Enlightenment doctrines, nationalism and liberalism. Their commitment to their Jewishness is an anti-religious racial (nationalistic) commitment legitimating their exclusive possession of the state apparatus. But their commitment to Modernity is

towards Jews and Jewish towards Muslims".

Denial of liberal rights to Muslims is manifested in every aspect of Israeli public policy from infrastructure construction to the provision of education and employment and the institutionalization of policing areas and segments. The legal and bureaucratic system is especially designed to "Judise" the land" – to wrest land from Muslim possession for the benefit of the Jews. In 90 percent of Israeli (non-occupied area) territory Muslims are legally debarred from owning or leasing land. In 2021, Muslims owned only 1.5 percent of land in Israel. Beyond the Green Line Israel's newly occupied territories have seen a massive growth of Jewish settlements and the displacement of Muslim nomadic tribes.

Like in Bharat, Poland and Hungary, some liberal practices continue to function in Israel proper. The press is capitalistically organized (it is "free") and there is freedom of association and movement. Obscenity and vulgarity in Israeli cultural life is flourishing and Jewish teachings are routinely ignored. In this sense Israel is a Jewish secular state and Zionism (like Muslim nationalism and Hindutva) is a movement which seeks to secularize a religion.

However, the 2023 legislation limiting the ambit of the judiciary shows that even the liberal rights of the Jewish citizenry are being curtailed. The legislative containment of the judiciary has mass support and demonstrations against it have proved futile. The Jewish ummah throughout the world (and especially in America) enthusiastically supports legal and economic discrimination against the Muslim citizens of Israel.

roots in Israeli policy from the time of the Nakba (1948) when Palestinian Muslims were slaughtered and expelled en masse. Up to 1966, Muslims were under military rule, effectively denied all liberal rights. From 1966 to 2000 military rule over the Muslims was relaxed in fits and starts. Since 2000 – and especially under the pressure of Netanyahu's rule – there has been sustained rollback of these concessions. Of course these concessions were not given to the inhabitants of the occupied West Bank and liberal democratic rights extended to Muslims remained confined to those who were regarded as Israeli citizens residing in the territory behind the so-called "Green line" and in 2022 equaling about 22 percent of the total Israeli citizenry.

This limitation of liberal democratic rights – its denial to Muslim Israeli citizens – is overwhelmingly popular among Israeli Jews. According to a 2016 PEW survey 79 percent of Israeli Jews approve of existing legal discrimination against the Muslims and 48 percent support the expulsion of all Muslims from Israel. Hatred of the Muslims is ingrained in Israel's national ideology which proclaims the essential Jewishness of the Israel state and Jewishness is by its nature incompatible with liberal democracy.

Islamic uprisings – the *Intifada* movements – against Israeli occupation, oppression and expulsion – and their relative effectiveness since 2002 – have strengthened the commitment to non-liberal values of the Jews.

Liberal democratic treatment is legitimately confined to Israeli Jewish citizens. As Ahmad Tibi, a member of the Knesset said in 2009, "This country is democratic

Dr. Javed Akbar Ansari

The Collapse of Liberal Democracy in Israel

Liberal democratic order is collapsing as an element in the gradual disintegration of the crisis ridden global capitalist system. This is occurring throughout the world – in Hungary, Poland, Turkey, many Latin American countries, even in the United States.

But this process of liberal democratic implosion is most advanced in two countries – Bharat and Israel, key exponents of liberal imperialism. Understanding the process of the deconstruction of liberal democratic order is of importance to Islamic revolutionaries who are committed to an overthrow of the rule of law of capital.

In this paper we seek to analyze the process of liberal democratic collapse in Israel as a case study. Is this Israeli episode typical or atypical of the general process of liberal democratic collapse?

The Israeli Case

Israel is a settler state, like America, Canada, Australia etc. established by the slaughter and expulsion of millions of original inhabitants of a country. It is not a colony and like all non colonial settler states justifies its conquests and its existence with reference to Enlightenment humanitarian values.

Liberal democracy is embedded in humanitarian ideology. Hence, as in other settler states, abandoning the liberal democratic paradigm is a matter of anxiety and frustration for the Israeli elites.

Nevertheless, liberal democracy has had vulnerable